سید الطاف بخاری

رقصِ آوارگی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رقصِ آوارگی

الطاف بخاری

قطعہ

ہم نے پتّھر تراشے صنم ہوگئے
پھر وہی پاسبانِ حرم ہوگئے
رِند پیاسا رہے تو بھی بدنام ہے
شیخ جی پی کے بھی مُحترم ہوگئے

اِنتساب

غزالہ بخاری کے نام

جِس نے میری کانٹوں بھری زندگی کو گُلستاں میں بدلنے کے لئے
اپنی ساری زندگی وقف کردی

All rights reserved with the Author.
Permission may be taken from Author/Publisher
to reproduce anything contained in this book.

باذوق قارئین کے لئے خوبصورت کتابیں نفاست اور قرینے کے ساتھ

نام کتاب: رقصِ آوارگی

شاعر: الطاف بخاری Cell: +1 (832) 638-3813
E-Mail: ahbukhari2009@yahoo.com

ناشر: سیّد حفیظ مخفی

سرورق: نیّر صدیقی

کونسپٹ: شفق

زیرِاہتمام: جہانِ ذوق، لاہور

طباعت: ماورا۔لاہور +92-300-4020955

بارِاوّل: ایک ہزار

ماہِ طباعت: اپریل 2021ء

قیمت: مجلّد کتاب PK. Rs. 650/- یورپ و امریکہ 10 $

ملنے کا پتہ: جہانِ ذوق ۴۱۸-ایمپریس ٹاور-ایمپریس روڈ-لاہور

فون نمبرز: +92312 666 4713, +9242 36297240

ای میل: hishashmi@gmail.com

ویب سائٹ: www.jahanezauq.org

فہرست

1	حرُوفِ افتخار	افتخار عارف	09
2	جان لیوا سفر کا کامیاب آغاز	حسن نثار	10
3	حرُوفِ وفا	مقصُود وفاؔ	11
4	الطاف بخاری ایک سچّا شاعر	سیّد حفیظ مخفی	15
5	کچُھ اپنے بارے میں	الطاف بخاری	18
6	حمدِ باری تعالیٰ		27
7	لا الٰہ الا اللہ		29
8	نعتِ رسول کریم ﷺ		31
9	اسمِ اعظم (نعتیہ نظم)		33
10	نذرانۂ عقیدت بحضُور سیّد الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام		36
11	بنتِ کشمیر		38

غَزلیات

12	محوِ گردش زمیں، آسماں رقص میں	42
13	تین اشعار	44
14	ہم کہ رہتے تھے دِلرباؤں میں	45
15	عِشق جب تک جان ودل کا رہنما ہوتا نہیں	47
16	ہم نے جب اُن سے پہلی ملاقات کی	49
17	محبّت کا وہ سلسلہ کیا ہُوا	51

فہرست

18	جب بھی قفلِ شَعور ٹُوٹے گا	53
19	رابطے کم ہوئے، فاصلے بڑھ گئے بھولے عہدِ وفا وہ بیگانے ہوئے	55
20	چاہتوں کا ثمر ہم نہیں جانتے	56
21	مجھے آج اِذنِ سفر چاہیئے	58
22	مِی رقصم	60
23	آشنائے غم ہوئے تو پھر خُوشی دیکھی نہیں	62
24	بظاہر اُن کی آنکھوں میں حکایت اور ہوتی ہے	64
25	شوخ آنچل جو اُڑ کر ہَوا ہو گیا	66
26	تیرے آنگن میں بھی	69
27	گھبرا کے پی گیا	72
28	اگرچہ نگاہوں میں اقرار ہے	74
29	خُمارِ آگہی	76
30	چراغِ آرزو	78
31	زُباں سے چاہت کے گیت گانا	81
32	ہے محبّت تو دل میں بڑی آپ کی	83
33	نئے منظر، نئے کَون و مکاں تک آ گیا ہُوں	85
34	آؤ! باتیں کریں	87
35	مُضطرب، بے ثمر، بے اماں زندگی	89

فہرست

36	میرے لب پہ جو حرفِ سوال آ گیا	91
37	آرزُوؤں کی، تمنّا کی کوئی بات کریں	93
38	نغمۂ محَبّت	95
39	مُخاطب جب بھی ہوتا ہوں جہاں سے	98
40	ایسا نہیں کہ ہم کو محَبّت نہیں رہی	99
41	سوچیں ہیں قیدِ لَب کو ہلانا بھی جُرم ہے	101
42	ہم نے جب بھی زُبان کھولی ہے	103
43	حُسن کو دیکھ کے جو حُسن کی رَغبت نہ کرے	105
44	میں نے تو دَرد کو سینے میں چُھپا رکھا ہے	107

نَظمِیات

45	مُجھے تُم یاد آتے ہو!	110
46	آئینِ تیرگی	111
47	ہم بولیں گے	113
48	وَیلنٹائن ڈے	115
49	یہ سب خواب تُمھارے ہیں	117
50	آئینۂ ذَات	119
51	تُمھارا موسموں سے کیا تعلّق ہے؟	121
52	تجدیدِ محَبّت کا جواز	125
53	رقصِ آوارگی	129

فہرست

54	سولہ دسمبر	132
55	تکمیلِ ذات	133
56	خزاں کی بارش	134
57	خواب	135
58	ساون اور سنّاٹے کے بیچ	137
59	فاختہ	141
60	اینڈ آف دی گیم	143
61	برما کے مُسلمانوں کے نام	145
62	اعترافِ حقیقت	150
63	تفریقِ صِدق وکَذب	155
64	مسیحاؤں کے نام	157
65	کورونا ہار جائے گا	158
66	میں پہلا مَعتُوب تو نہیں ہُوں	161
67	جنگ	163
68	آرزُوئے بندگی	165
69	میں اِس لَہو کا خراج لُوں گا	169
70	بیج	173

حروفِ افتخار

مِی رُقصم کی روایت کے تسلسل میں الطافؔ بخاری کی کتاب کا مسوّدہ ''رقصِ آوارگی'' دیکھا تو جی خُوش ہوا اور دل سے دُعا نکلی کہ اُردو کی بستیوں سے بہت دُور نئی زمینوں میں کیسے اچھے اچھّے شاعر اپنی تخلیق کے جوہر دکھا رہے ہیں۔ اعتراف کیا جانا چاہیئے اُن تخلیق کاروں کا جو ستائش اور صلے کی پرواہ کئے بغیر دوسرے ملکوں میں تمام آسُودگیوں کے باوجود اپنی ادبی سرگرمیوں میں مصرُوف رہتے ہیں اور اپنے تعلّق اور نسبت کو لفظوں کا جامہ پہناتے رہتے ہیں۔

الطافؔ سیّد نے نظمیں بھی کہی ہیں اور غزلیں بھی اور اپنی مشرقی شعری روایات میں اپنے رُوحانی سرچشموں کو بھی اپنے شعر کا موضوع بنایا ہے۔ دونوں اصنافِ سُخن میں اِن کی پُرثروت ہُنرکاری نمایاں نظر آتی ہے اور خُوشگوار لطف و انبساط کی کیفیت محسُوس ہوتی ہے۔

یہ مجموعہ شعر، شاعر کی پہلی پیش کش ہے۔ ظاہر ہے کہ اس فنّی کامیابی کے بعد شاعر ایک تازہ یقین کے ساتھ اپنا آئندہ کا سفر جاری رکھے گا جو پُررونق بھی ہوگا، ثروت مند بھی اور قابلِ توجّہ بھی اور مجُھے اس کا پُورا یقین ہے۔

احمد مشتاقؔ، عارف امامؔ، عشرت آفرینؔ، افضال فردوسؔ اور غضنفر ہاشمیؔ کو اپنے قبیلے میں ایک نئے اور اچھّے شاعر کا اضافہ مبارک ہو۔

افتخار عارف

۲۳ ۲۰۲۰

جان لیوا سفر کا کامیاب آغاز

میں سیّد الطاف بخاری کو نہیں جانتا تھا۔ یہاں تک کہ کبھی دیکھا تک نہیں تھا۔ سو' جب مجُھے اُس کی شاعری کا مسّودہ ملا تو سچّی بات ہے کہ اک ''بوجھ'' سا محسُوس ہوا۔

پھر چند دن تک میں مسّودے کو اور مسّودہ مجُھے دیکھتا رہا۔ پھر ایک نیم شام' نیم دلی سے ''رقصِ آوارگی'' کی پہلی جھلک دیکھی تو قونیہ میں مولانا رومؒ کے مزار پر دیکھا رقصِ ''درویش'' اور اُس کے رقّاص یاد آ گئے۔

صفحہ دَر صفحہ' دائرہ دَر دائرہ' شعر دَر شعر' رقص دَر رقص دیکھ کر یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ کچّا سونا' سونے اور پھر یہ سونا کُندن بننے کے جان لیوا سفر کا کامیاب آغاز کر چُکا ہے اور میری دُعائیں بھی اِس کے رختِ سفر میں شامل ہیں۔

حسن نثار
22.11.20

حرُوفِ وَفا

میں اِن صفحات پر بطورِ خاص اِس لئے حاضر ہُوا ہُوں کہ مجھے الطافؔ بُخاری کی شاعری پر بات کرنی ہے۔ لیکن پہلے میں اِن سے اپنی ذاتی وابستگی کے حوالے سے بات کرنا چاہوں گا۔ کیوں کہ اِن کی شخصیّت میں جو محبّت ہے وہ بھی شاعرانہ ہے۔ پہلے پہل میں اِس محبّت کو پہچاننے کی کوشش کرتا رہا' جس میں اِنتہائی احترام کے ساتھ ایک والہانہ پن کی دلآویز گرم جوشی بھی تھی جس سے مجھے یہ احساس ہوا کہ میں اِن سے کئی بار مل چُکا ہُوں لیکن یہ مُلاقات کب اور کہاں ہُوئی؟ مجھے یاد نہیں آیا۔

ایک دن اچانک اِن کا فون آ گیا۔ اتنی لمبی بات ہوئی کہ چائے کا کپ میز پر پڑا پڑا ٹھنڈا ہو گیا لیکن اِن کی باتوں میں اپنائیت کی گرم جوشی نے مجھے یُوں مُتاثر کیا جیسے ہم بہت پُرانے دوست رہ چُکے ہیں۔ اِن سے گفتگُو کے دوران میں ہمارے عہد کے بہت بڑے شاعر اخترؔ حسین جعفری صاحب کا تذکرہ چِھڑ گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اِس تعلّق میں جعفریؔ صاحب موجود ہیں۔ یہ وہ لمحہ تھا جب میں نے الطافؔ بُخاری کی محبّت کو پہچان لیا۔ اخترؔ حسین جعفری صاحب کی صُحبت میں بیٹھنے والے لوگوں کے درمیان ایک رُوحانی رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ اُن کی محفل میں بیٹھنے والے لوگ کبھی آپس میں ملے ہوں یا نہ ملے ہوں' ایک دوسرے کو آسانی سے پہچان لیتے ہیں۔ کیونکہ جعفریؔ صاحب کے آستانے سے آنے والا شخص بیابان میں ہو یا شہروں کے ہجوم میں' اپنی شناخت قائم کر لیتا ہے۔ وہ غزل کہے یا نظم اُس کی ہر تخلیق میں بہر حال ایک ایسے انسان کا عکس سامنے آتا ہے جس کا دل انسانیت کے لیے دھڑکتا ہے' جو ایک مُہذّب اور مثالی مُعاشرے کی تشکیل کا خواب دیکھتا ہے۔ الطافؔ بخاری سے رُوحانی تعلّق کو پہچان لینے کے بعد مجھے اِن کے "رقصِ آوارگی" میں وہ جذبۂ شوق دکھائی دینے لگا جو اپنی ہر اَدا میں سُخن کرتا ہے اور سُنائی دینے کے علاوہ دِکھائی بھی دینے لگتا ہے۔ سو میں الطافؔ بُخاری سے راہ و رسم بڑھانے کیلئے گاہے بگاہے اِن کی شاعری پڑھنے لگا۔ اِن کے کئی اشعار اور نظموں کی سطریں مجھے متوجّہ کرنے لگیں اور مجھے کئی بار اِن کا

سُخن اپنے وِجدان میں رکھنے لگا۔

دمِ قیسؔ سے تو بیاباں بَسے
مگر بعد میں شہر کا کیا ہوا ؟

یہ وَالہانہ کیفیات اِن کی شاعری میں جابجا نظر آتی ہیں۔ جن میں آباد بیاباں کو شہروں نے ویران کیا ہے مگر احساس کی پگڈنڈیوں پر الطافؔ بُخاری کا بے نیازانہ رقص کہیں نہیں تھا۔ اِنہوں نے کئی معرُوف اور مقبول زمینوں میں غزلیں کہی ہیں جن میں رَدیف قافیہ کی مَوسیقیّت اور بولتا ہوا آہنگ موجود ہے۔ ایسی غزلیں عام طور پر مُشاعروں اور محفل آرائیوں کو گرماتی ہیں مگر فکری چاشنی ہو یا اِن کا نظریۂ زندگی ہو ہر جگہ مکمل سچّائی کے ساتھ جلوہ افروز رہتا ہے۔ وہ ہر دَور میں اپنے تازہ رہنے والے خُون کی اہمیّت اور قیمت سے بھی واقف ہیں اور اُن دِین فروشوں کو بھی پہچانتے ہیں جو اختیار و اقتدار کے لئے نظریات کو بازار میں اشیاء بنا کر بیچتے ہیں:

سرِ بازارِ کوفہ نوکِ نیزہ سے صدا اُبھری
مُصلّے بیچنے والو! امامت اور ہوتی ہے

شیخوپورہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں سے چل کر ہیُوسٹن کی کُشادہ سڑکوں پر گاڑی چلانے تک کا سفر الطافؔ بُخاری نے اپنی سچّائی کا دامن تھام کر طے کیا ہے۔ یہ اچھّی طرح سے جانتے ہیں کہ ”رقصِ آوارگی“ کا یہ سفر سیاسیٔ سماجی اور تاریخی حقیقتوں کو سمجھے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ یہ اپنی سچّائی کے مرکز سے ایک لمحے کیلئے بھی جُدا نہیں ہوتے جس نے اِن کے دل و دماغ کو روشن کر رکھا ہے۔ دُنیا سے چِمٹی ہوئی خلقت کا طریق کبھی بھی اِن کو اپنے بہکاوے کی چکا چوند سے مُتاثر نہیں کر سکا۔

میں گاؤں سے شہر پُہنچا تو یہ پہلا سبق سیکھا
محبّت اور ہوتی ہے ضَرورت اور ہوتی ہے

الطافؔ بُخاری کی شاعری میں ایک رُومان پرور فضا بھی موجود ہے جو اِن کے دل میں بسے

ہُوئے چمن زار کے بعض گوشوں میں اُداسی بن کر پھیل جاتی ہے مگر اطراف کے پُرکشش مناظر کا حُسن دوچند کر دیتی ہے۔ یہ رُومانوی اُداسی اِن کے اشعار میں ایک ایسی مَعنویّت بن کر اُبھرتی ہے جو درد ِدل کو اپنے کام میں لا کر نِہال بھی کرتی ہے۔

بھلانا تو مُشکل ہی تھا آپ کو
مگر یاد رکھنا بھی دُشوار ہے

سرشاری میں مَست، محوِرقص اِس شاعر نے غزلوں کے ساتھ ساتھ نظموں میں بھی اپنے ہُنر کو آزمایا ہے۔اِن کی نظموں کے زیادہ تر مضامین سیاسی وسماجی ہونے کے علاوہ ہماری تہذیبی روایات سے بھی جُڑے ہُوئے ہیں جو اِن کی سُخن سازی کو مہمیز لگاتے ہیں۔ الطاف بُخاری اپنے اردگرد کے حالات کو پُوری آنکھیں کھول کر دیکھنے کے عادی ہیں اور اِن حالات کا درست اور مبنی بر حقیقت تجزیہ کرنے کا فن بھی جانتے ہیں۔ ظلم کہیں بھی ہو، ناانصافی کہیں بھی ہو رہی ہو الطاف بُخاری کی نظموں میں اِس بربریت کے خلاف آواز اُٹھتی ہوئی سُنائی دیتی ہے۔

''آئینِ تیرگی'' اِن کی بھرپور آواز کی بہت عُمدہ مثال ہے۔ اِس نظم میں اِن کے الفاظ اِن کے اندر سے اُبھرتی ہوئی آواز کے معنی سے پوری طرح ہم آغوش ہیں جو اِن کی تخلیقی قوّت کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ مُجھے اِن کی نظم ''میں پہلا معتُوب تو نہیں ہُوں'' بہت پسند ہے یہ نظم اِن کے تخلیقی مزاج کو قاری پر کافی حد تک کھولتی ہے۔ اِس نظم میں مَحبّت کی وارفتگی بھی ہے اور زنجیروں کے ساز پر رقص کرتا ہوا، دھمال ڈالتا ہوا بے نیاز جسم بھی موجود ہے۔ جو قاتل کی گاڑی ہوئی صلیب تک انا الحق کے نعرے لگاتا ہوا پابہ جولاں چل رہا ہے۔ یہ بے خُودی اس کتاب کے شاعر کا بنیادی وصف ہے جس نے اِسے شعر کہنے کی طرف راغب کیا ہوا ہے۔

الطاف بُخاری کی نظمیں پڑھتے ہوئے بارہا مُجھے یہ محسُوس ہوا ہے کہ اِن کا جوہرِ تخلیق اِن کی نظموں میں زیادہ کُھل کر سامنے آتا ہے۔ سو میں یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ اِن کو اپنی نظم گوئی پر زیادہ توجّہ دینی

چاہیئے تاکہ اِن کا یہ ہُنر مزید نکھر کر سامنے آسکے۔ دوسری اہم بات جو اِن کی شاعری پڑھتے ہوئے مجُھے شدّت سے محسُوس ہُوئی ہے وہ یہ ہے کہ اِنہوں نے شاعری کو اُتنا وقت نہیں دیا جتنا درکار ہوتا ہے۔ شاعری یہ تعطّل برداشت نہیں کرتی اور خاص طور پر نظمیہ شاعری لگاتار توجّہ چاہتی ہے کیونکہ شاعری اُس نازنین محَبُوبہ کی طرح ہوتی ہے جو ہمہ وقت اِلتفات کا تقاضا کرتی ہے اور اگر اِس کتاب کے شاعر کو اپنے پہلے پڑاؤ کے بعد لیلائے سُخن کی ہمَرہی میں مزید منزلوں کی طرف سفر اختیار کرنا ہے تو اِنہیں شاعری کیلئے وہ وقت نکالنا ہوگا جو شاعری کی ضرُورت کو پُورا کرتا ہے۔

میں یہ بھی جانتا ہوں کہ الطافؔ بُخاری جیسے محَبّتی انسان میں ہر خواہش سے زیادہ اظہار کی خواہش، اپنی شدید صُورت میں موجود ہوتی ہے۔ اِس کا اندازہ مجُھے اِن کے شعری مجمُوعے کا مسوّدہ پڑھتے ہُوئے ہُوا ہے۔ مجُھے اِس کتاب میں درَج تخلیقات سے معلوم ہوا ہے کہ یہ الفاظ کی معَنوی حُرمت پر یقین رکھتے ہیں اور اچھّی طرح جانتے ہیں کہ شاعری جُز وقتی کام نہیں ہے۔ یہ ایک اچھّے شاعر کے ساتھ، پُوری زندگی کا ساتھ اور پُوری توجّہ مانگتی ہے۔

اِس کتاب کی اشاعت پر مجُھے اس لئے بھی خُوشی ہے کہ یہ ایک دردمند دل رکھنے والے شاعر کا پہلا پڑاؤ ہے جہاں وہ رقص کرتا ہوا پُہنچا ہے اور دُنیا کی چمک دمَک سے بے نیاز ہو کر اپنے اندر کی روشنی میں جینا چاہتا ہے۔ الطافؔ بُخاری کا یہ والہانہ پنَ مجُھے پُراُمید کرتا ہے کہ آئندہ چل کر یہ اپنا تخلیقی تعَطّل دُور کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے مقامِ رقصِ آوارگی کیلئے نئی راہیں بھی تلاش کریں گے۔

مُعاش کے پہیئے پر گھُومتی ہوئی زندگی الطافؔ بُخاری کو وطن کی مٹی سے دُور ضرُور لے گئی ہے مگر، شاعری نے اِنہیں اِن کو اپنے پیاروں سے دُور نہیں ہونے دیا۔ اِن کی طرزِ نگارش میں ایسی خُوشبو مہکتی ہے جس نے سمندروں کے نمکین پانیوں سے گُذرتے ہوئے بھی اپنے وجُود کو قائم رکھّا ہے۔ میں اِن کی اِس کاوش کو انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں، جس میں محَبّت ہی محبّت ہے، خیرَ ہی خیرَ ہے۔

مقصود وفاؔ

الطاف بخاری ایک سچّا شاعر

شعر کسے کہتے ہیں؟

اِس سوال پر آج تک کوئی مُتفّق علیہ جواب سامنے نہیں آ سکا۔ لیکن میرا ماننا ہے کہ جب جذبات کو تَصوّر کا قالب مل جائے اور تَصوّر کو الفاظ کا مُتناسب بدن میسّر آ جائے تو شعر خلق ہو جاتا ہے۔ مُجھے یہ بھی تسلیم ہے کہ ہر شخص اپنے معرُوضی حالات، کیفیّات اور احساسات کو اپنے مُنفرد زاویۂ نگاہ اور مُختلف جہت سے پرکھتا ہے۔ ایک منظر، ہر شخص کیلئے الگ معنوی حُسن رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص وَجدان، مِیلان اور رُجحان کے معاملے میں بھی دوسرے سے مُختلف اور مُنفرد ہے۔ چنانچہ، جمالیات میں حقیقت تلاش کرنے کی بجائے ایک سچّا اور کھرا شاعر اُسے تخلیق کرتا اور بنا سنوار کر پیش کرتا ہے۔ ایک طبقۂ فکر کا اصرار ہے کہ جو کلام عطائے رَبّی کے طور پر وجُود میں آتا ہے، وہ شعر ہے اور ایک حلقے کا اصرار ہے کہ شعر مترنّم انداز میں دِلی کیفیات کے اظہار کو کہتے ہیں۔ پھر شُعراء اور فلاسفر کی بحثوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ کچھ کا کہنا ہے کہ شعر میں تخیّل اصل ہے اور کُچھ کا کہنا ہے کہ وزن کے بغیر شعر ہوتا ہی نہیں۔ ایک (School of Thought) کا کہنا ہے وزن کی اہمیّت نظم میں زیادہ ہے شعر میں نہیں اور الطاف حُسین حالؔی بھی اسی سکول کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔ اُن کے نزدیک بھی بغیر وزن کا شعر ایسا تھا جیسے بِنا بول کے راگ۔ اِسی طرح ایک اور گروہ کا کہنا ہے کہ وَزن، قافیئے اور قصد کے بغیر شعر مَوزوں نہیں ہو سکتا۔

اِس سارے تناظر میں، الطافؔ بخاری کی شاعری ایک اچھُوتے تخیّل سے نُمو پا کر تمام شعری لوازم کو سمیٹے تخیّل سے وجُود کے قالب میں ڈھلتی نظر آتی ہے۔ وزن، موسیقیت، تشبیہات، استعارات، فصاحت و بلاغت غرض یہ کہ شعری حُسن و جمال کیلئے جن شرائط کو بھی لازم قرار دیا گیا ہے وہ سب کی سب الطافؔ بخاری کی شاعری میں پُورے وجُود کے ساتھ موجُود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کا

حُسن اپنے ہر رنگ، ہر زاویئے اور ہر صَنف میں اپنی انفرادیت کا احساس دِلاتا ہے۔

الفاظ کے ساتھ اِن کی مَحبّت کا یہ عالم ہے کہ مَوصوف الفاظ سے مصوّری کرتے اور شعری قرطاس پر شہکار اُبھارتے چلے جاتے ہیں۔ اِن کی یہی تخلیقات ہمارے جذبات کو بیدار کرتی اور سماعت کو لطف بہم پہنچاتی ہیں۔ اِن کے اکثر اشعار پڑھتے ہم بے اختیار پھڑک اُٹھتے ہیں۔ الطاؔف بُخاری عَصرِ حاضر کا وہ شاعر ہے جس کی (Aesthetic Energy) جمالیاتی توانائی شعری تخلیق میں پوشیدہ ہے۔ یہ جس انداز میں الفاظ، تشبیب، استعارے، کنایئے اور علامت کے استعمال سے اپنی تخلیق میں حُسن کو اُبھارتا ہے، جس انداز میں شعری قافیہ پیمائی کی بجائے معنویّت کو مدّنظر رکھتا ہے وہ محدُودے چند شُعراء کا خاصا رہا ہے۔ اَبہام اور مُبالغے سے پاک قُوتِ واہمہ سے کام لے کر اپنی تخلیقی صلاحیّتوں کو کُمک پہنچانا الطاؔف بُخاری ہی کا امتیاز ہے۔ الفاظ کی موزوں ترتیب کے ساتھ ساتھ خیال کی گہرائی، کیفیّت اور احساس کی فراوانی، شعری تجربے اور شعریت نے الطاؔف بُخاری کو آج کے بیشتر شاعروں سے کہیں آگے لا کھڑا کیا ہے۔

''رقصِ آوارگی'' میں آپ الطاؔف بُخاری کی کسی بھی حمد و نعت یا غزل و نظم کو پڑھ لیں، کہیں بھی شعریت اور شعری اظہار کا میلان کم ہوتا نظر نہیں آئے گا۔ اِن کی شعری اَصناف کا جادُو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ مُجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ الطاؔف بُخاری کی جڑیں شاعری میں بہت گہرائی تک پیوست ہیں۔ اِن کی شاعری تَہذیب کی رگوں میں بہتے لہُو سے کشید ہو کر ہمیں ہماری اپنی تہذیب و تمدّن کے کئی پہلوؤں کی برہنگی اور نہنگی کا احساس دِلاتی نظر آتی ہے۔

محض چند برسوں میں الطاؔف بخاری نے مغربی دُنیا میں اپنا شعری قد کاٹھ خوب نُمایاں کر لیا ہے۔ اِن کی شعری تخلیقات کی قندیلیں جس انداز میں روشنی پھیلا رہی ہیں اُس کے پیشِ نظر مُجھے یقین ہے کہ آئندہ چند برسوں میں اِس سچّے شاعر کو بین الاقوامی ادب قبیلے میں اپنا اصل اور جائز مقام و مَرتبہ مل کر رہے گا، جس سے بین الاقوامی شعری اَدب کا سر کچُھ اور بھی بلند ہو جائے گا۔

سیّد حفیظ مخفی اپریل ۲۰۲۱ء

کُچھ اپنے بارے میں

الطاف بخاری

قارئین کرام!

عُمر بھر کاغذ اور قلم سے کھیلتے رہنے کے باوجود بھی اِن صفحات پر آپ سے مُخاطب ہونا واقعی ایک کٹھن مرحلہ ہے۔ ''اپنے بارے میں'' لکھنا اور وہ بھی پُورا سچ لکھنا' جان جوکھم میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ اِس پر حالت یہ ہے کہ ''دامنِ اعمال'' میں کوئی ''رائجُ الوقت'' اثاثہ بھی موجود نہیں۔ لیکن اِدھر ''رقصِ آوارگی'' کے پبلشر اور میرے بے حد پیارے بھائی سیّد حفیظ مخفیؔ کا حُکم ہے کہ اپنا تعارف خُود لکھو۔ چُنانچہ' چاروناچار میں نے اپنی زنبیلِ ادب کو کھنگالا اور اِس میں موجود شعُراء کی کُتب کا جائزہ لیا جہاں تعارف میں بالترتیب ابتدائی تعلیم سے اعلیٰ تعلیم' ڈگریاں' شاعری کی ابتداء اور بتدریج ترّقی' عصرِ حاضر کے بڑے شعُراء سے تعلّق' پھر ادبی منازل طے کرتے ہُوئے مُلک اور بیرونِ مُلک پذیرائی' انعامات' ایوارڈز' میڈلز کی بھرمار اور پھر مدّاحوں کے بے پناہ اصرار پر کتاب کی اشاعت وغیرہ کا احوال ایک خاص انداز میں بہار آفریں نظر آیا۔ اب یہ اتّفاق ہی ہے اور جسے میں اپنے لئے خُوش قسمتی قرار دیتا ہوں کہ میرا دامن اِن تمام ''درجاتِ عالیہ'' سے یکسر خالی ہے۔

میرے والد محترم کا تعلّق پوٹھوہار سے اور والدہ صاحبہ کا تعلّق آزاد کشمیر کے ایک معرُوف گھرانے سے تھا' جن کی ایک مضبُوط مذہبی شناخت تھی۔ چنانچہ' والد صاحب تعلیم سے فارغ ہوکر اپنے اُساتذہ اور شیخ کے حُکم پر پنجاب کے مختلف اضلاع' راولپنڈی' سرگودھا اور شیخوپورہ میں دینی خدمات سرانجام دیتے رہے اور اِس دوران میں اُنہوں کئی مساجد اور دینی مدارس تعمیر کرائے۔ پھر ۱۹۸۰ء میں شیخوپورہ کے قریب فارُوق آباد میں مُستقل سکُونت اختیار کر لی اور ۱۹۸۶ء میں اِسی مقام پر آپ نے وفات پائی اور یہیں آپ کا مزار اور مدرسہ قائم ہے۔

جہاں تک میرا تعلّق ہے تو میری تمام بنیادی اور اعلیٰ تعلیم ایک دُور اُفتادہ گاؤں کے ایک چھوٹے سے سرکاری پرائمری سکول میں شروع ہو کر وہیں پر مکمل بھی ہوگئی۔ مطلب یہ کہ پرائمری

جماعت پاس کرنے کے بعد (جس کا سرٹیفکیٹ بھی نہیں ملا) میں کسی اور تعلیمی ادارے میں داخل نہ ہو سکا اس لئے تعلیم کا مُعاملہ تو بس یہیں تک رہا۔ مگر، کم سنی ہی میں حادثات وصدمات کا ایک لامتناہی سلسلہ چل نکلا اور حالات وواقعات کی ڈور اُلجھتی چلی گئی جس نے میری پُوری زندگی کو ہی تلپٹ کر کے رکھ دیا۔ جن کا تذکرہ اِن صفحات میں کرنا لا حاصل ہے۔

ہوش سنبھالا تو زندگی ایک کٹی پتنگ کی طرح حوادث کی ہوا میں ڈولتی سنبھلتی دکھائی دی۔ میں اپنی خاندانی روایات سے باغی تو کبھی نہیں رہا لیکن گریز پا ضرور رہا ہوں۔ اِسی گریز پائی نے مجھے اُن روایات کو اپنانے اور اُن میں اپنا مقام نہ بنانے دیا۔ یُوں لازم تھا اپنا بار اپنے کاندھے پر اُٹھایا جاتا۔ البتہ اِس تھکان زدہ رَستے پر مجھے اپنی ماں کی دُعاؤں کی چھتر چھایا ہمیشہ سایہ فگن محسُوس ہوتی رہی اور اُن کی اِنہی روشن دُعاؤں کا ہالہ آج بھی میرے وجُود کے گرد اپنا نورَانی حصاُر بنائے ہوئے ہے۔

یقیناً، میں مُروّجہ تعلیم حاصل نہ کر سکا اور اَن پڑھ ہی رہا۔ لیکن مُجھ میں موجود سیکھنے اور مُشاہدہ کرنے کی فِطری خُو موجود تھی اِسی وجہ سے قلم اور کتاب سے محَبّت ہر حال میں قائم رہی۔ شاعری مجھے اچھّی لگتی تھی اور میں ہر تحریر کو پڑھنے کی کوشش کرتا تھا۔ چنانچہ، پہلی جماعت سے پانچویں جماعت تک سکول سے آنے کے بعد میں اُن کتابوں کی دُنیا میں کھو جاتا تھا جو والد صاحب کے سرہانے موجُود ہوتی تھیں۔ والد صاحب چونکہ مذہبی سکالر تھے اِس لئے اُن کے کُتب خزانے میں ہر قسم کی دینی و دُنیاوی کُتب موجود رہا کرتی تھیں۔ اہم بات یہ رہی کہ والد صاحب نے مُجھے کبھی اِس کُتب بینی سے منع نہیں فرمایا تھا۔ البتہ وہ مُتجسّس ضرُور رہے ہوں گے کہ میں اپنے سکول کے قاعدے کو نظر انداز کر کے اِن مُشکل اور خُشک کتابوں میں آخر کیا کھوجتا رہتا ہُوں۔ ممکن ہے اُنہیں یہ گُمان بھی گُذرتا ہو کہ بھلا مُجھ جیسے طفلِ مکتب کو اِن ثقیل کتابوں کی کیا سمجھ آسکتی ہے۔

جب میں پانچویں جماعت میں اوّل آیا تو میرے ایک اُستاد جناب قاضی اصغر علی صاحب نے جو اُردو اور فارسی ادب پر خاصا عبور رکھتے تھے، مُجھے مُنہ مانگا انعام دینے کا اعلان کیا۔ اُن کا خیال تھا کہ میں کوئی کھلونا یا نقد رقم یا پھر زیادہ سے زیادہ بائیسائیکل کی فرمائش کروں گا جو وہ میرے والد صاحب

سے کہہ کر دلا دیں گے۔ لیکن جب میں نے اُن سے انعام میں ''کُلیاتِ اقبالؒ'' کی فرمائش کر دی تو اُن کی حیرت دِیدنی تھی۔ اُنہوں نے مجُھے بازوؤں سے تھام کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا کہ ''بیٹا' تمہُیں پتا بھی ہے کہ تُم کیا مانگ رہے ہو؟ کیا تُم ''کُلیاتِ اقبالؒ'' پڑھ لوگے؟'' جس پر میں نے عرض کی کہ میں ''بانگِ درا''، ''زبورِ عجم''، ''سیفُ الملُوک'' اور ''ہیر وارث شاہ'' وغیرہ پڑھ چُکا ہُوں اور اب ''اَسرارِ خُودی'' اور ''رموزِ بےخُودی'' پڑھنا چاہتا ہوں۔ میری اِس جسارت پر وہ مجُھے اپنے آفس لے گئے اور اقبالؒ کا کوئی شعر سُنانے کو کہا تو میں نے یہ شعر مکمل تشریح کے ساتھ اُن کی نذر کر دیا:

تُو بچا بچا کے نہ رکھ اِسے' تیرا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شِکستہ ہو تو عزیز تَر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

اِس غیر یقینی صُورتحال میں قبلہ اُستادِ مُحترم کے ماتھے پر پسینہ اُتر آیا تھا۔ اِس واقعہ کو پیش کرنے کا مقصد یہ واضح کرنا تھا کہ شعر فہمی کا وَصف ایک فطری صلاحیّت کے طور پر میرے خمیر میں موجود تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب میں نے لاہور میں آوارہ گردی شروع کی تو میرا اٹھکانہ اکثر و بیشتر دِی مال لاہور پر قائم پاک ٹی ہاؤس ہُوا کرتا تھا۔ اِسی دَور میں ''فنُون'' پڑھنے کو ملا اور مُتعدد مرتبہ احمد ندیم قاسمؔی مرحُوم کے دفتر میں حاضری دی' جہاں خالؔد احمد جیسی مُستند ادبی شخصیات موجود ہوتیں اور ہم بس چُپ چاپ ایک گوشہ سنبھالے اُن اَدبی ہیروز کی گُفتگو سے سیراب ہُوا کرتے۔ اِسی طرح ریواز گارڈن میں جناب پیاؔم شاہجہان پوری سے کئی مُلاقاتیں رہیں پھر جب اُنہوں نے اپنا اخبار نکالا تو اُس میں خبروں کے ساتھ ساتھ ہم نے کئی الٹی سیدھی تحریریں بھی لکھیں جنہیں وہ ازراہِ شفقت شائع فرما دیا کرتے تھے۔ اُنہی دنوں' میں نے اپنا پہلا شعر لکھا جو کہ غالبًا پنجابی میں تھا۔ پھر اکثر ایسا ہونے لگا کہ میں شعر لکھتا' دوستوں کو سناتا اور ضائع کر دیتا۔ اُس دَور کی شاعری ہی کیا' کوئی بھی تحریر محفوظ نہ کر سکا کہ اِس کا خیال ہی نہیں آیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۲۰۱۲ء تک اپنی لکھی ہوئی کوئی تحریر میرے پاس محفُوظ نہ تھی۔

اِسی ضمن میں ایک واقعہ میرے ذہن میں نقش ہے۔ ہُوا یُوں کہ میں نے ایک نظم لکھی اور ایک محفل میں ایک نامَور شاعر کو سُنادی۔ موصُوف نے بدّدلی سے سُنی اور فرمایا کہ ''بس' ٹھیک ہی ہے'' پھر کچُھ دن

بعد ایک مُعتبر جریدے میں وہی نظم اُن شاعرِ نامدار کے نام سے شائع دیکھ کر خاصی حیرت ہُوئی میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ مایوسی تھی' یا اذّیت تھی۔ تاہم آج بھی اُس واقعہ کی یاد اُسی کیفیت میں مُبتلا کر دیتی ہے۔

غالباً ۱۹۹۶ء میں' مرحُوم اختر حسین جعفریؔ کی شہرہٗ آفاق کتاب ''جہاں دریا اُترتا ہے'' شائع ہُوئی تو ہر جا اُس کے تذکرے ہونے لگے۔ اِس سے پہلے اُن کی کتاب '' آئینہ خانہ'' مقبُولیّت کے ریکارڈز قائم کر چکی تھی اور اُسے ''آدم جی ایوارڈ'' بھی مل چُکا تھا۔ مجُھے مرحُوم کے چھوٹے بھائی مظہر حسین جعفریؔ نے یہ شاہکار کتاب پڑھنے کیلئے دی لیکن تمام کتاب پڑھنے کے بعد ایک لفظ بھی میرے پلّے نہیں پڑا۔ وہ ایک ایسی بین الاقوامی شہرت کی حامل کتاب تھی جس کے بارے میں اُس دَور کے بڑے بڑے شعُرائے کرام نے تبصرے کئے تھے۔ کسی نے جعفریؔ صاحب کو ''نظم کا بادشاہ'' اور کسی نے ''عہدِ حاضر کا غالبؔ'' کہا تھا لیکن اُسی شاندار شاعری کی مُشکل اور ثقیل نظموں نے مجُھے تو چکرا کر رکھ دیا تھا۔

سُخن سازی' وَرق سازی
کُھلے احساس کی چاندی
مُسلسل ضربتِ دل اور رُوپہلی سطر کا وعدہ

میں کتاب لے کر مختلف دوستوں کے پاس گیا کہ میں بھی کُچھ سمجھ سکوں۔ لیکن ہر ایک نے ایک سا جواب دیا کہ ''یہ شاعری میری سمجھ سے آگے کی چیز ہے''۔ کسی نے کہا کہ ''جعفریؔ صاحب کی شاعری پڑھنے کے بعد بندہ اور کچُھ پڑھنے کے قابل ہی نہیں رہتا''۔ کسی کا تبصرہ تھا کہ ''بھائی! یہ شاعری سیاہ بالوں کو سُفید کر دے گی۔''

اُردو کے ایک پروفیسر صاحب جو شاعر بھی تھے اُنہوں نے کہا ''میاں! جب میں ریٹائرڈ ہو جاؤں گا تب آنا' دونوں مل کر سمجھنے کی کوشش کریں گے۔''

اِن تبصروں نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور میں نے چیلنج کے طور پر یہ فیصلہ کیا کہ ''اپنے سیاہ بالوں کو ہی سفید کر لیا جائے۔'' چُنانچہ' کتاب لے کر بیٹھ گیا اور ''جہاں دَریا اُترتا ہے'' پڑھنے اور سمجھنے لگ گیا۔ اور پھر.... اب میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ جس انداز میں اور جس گہرائی و گیرائی میں، میں

نے جعفری صاحب کو پڑھا اور سمجھا ہے شاید ہی کسی نے ایسا کیا ہو۔ چنانچہ ایک وقت آیا کہ بہت سے شعرائے کرام لاہور میں جناب جعفری صاحب کی رہائش گاہ پر جمع ہوتے اور میں مرحوم کی نظمیں پڑھتا اور اُن نظموں کی تشریح کرتا۔ ایک بار اُن کے بھائی نے فرطِ جذبات میں کہا کہ "معلوم نہیں بھائی اتنی جلدی کیوں اِس دُنیا سے چلے گئے؟" جس پر میرے مُنہ سے بے ساختہ نکلا کہ "میں تو حیران ہوں کہ وہ اتنا عرصہ زندہ کیسے رہے؟ کیوں کہ جس شخص کے اندر سے ایسی شاعری برآمد ہُوئی ہے اُس کا سانس لینا کس قدر دُشوار ہوگا۔"

اِن صفحات کو لکھنے کے دوران میں، میں نے جعفری صاحب کے دونوں صاحبزادوں منظر حسین اختر جو خُود بھی ایک نامور شاعر ہیں اور اسلام آباد میں ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ہیں اور امیر حسین جعفری جو نامور محقّق اور نقّاد ہیں، سے بات کی تو دونوں نے ایک جیسی بات کی کہ "ہم تو آج بھی یہی سمجھتے ہیں کہ جس طرح آپ نے ہمارے والد مرحوم کی شاعری کو پڑھا اور سمجھا ہے شاید ہی ایسا کسی اور نے پڑھا اور سمجھا ہو اور یہ کہ اختر حسین جعفری کی نظم کے سچّے وارث آپ ہی ہیں۔" ہاں، مگر ایک وضاحت کرتا چلُوں کہ میرا دعویٰ نظم کو پڑھنے اور سمجھنے کا ہے، نظم لکھنے کا ہرگز نہیں ہے۔

پھر ۲۰۰۳ء میں میری شادی کا دل گُداز حادثہ رُونما ہوا۔ یہ وہ پہلا حادثہ تھا جو میرے لئے بے حد خُوشگوار ثابت ہوا۔ اِس دل فریب اور دِل کش حادثے نے میری زندگی کے معانی و مفہُوم کو بدل کر رکھ دیا۔ مالکِ کائنات نے مجُھے ایسی شریکِ حیّات عطا کی جس نے میری رُوح تک میں اُترے زخموں کو نہایت سُرعت سے مُندمل کر دیا۔ میری راہگُذر سے تمام کانٹے چُن کر گُلابوں کی ایسی مہک بھر دی جس نے آج تک میرے ہر مَسامِ جاں کو مُعطّر اور مسرُور کر رکھا ہے۔ یہ میری شریکِ حیات ہی کا وصف ہے جس نے اپنی زندگی میرے نام وقف کر کے مجُھے زندہ رہنا اور زندگی میں آگے بڑھنا سکھایا ہے۔ ورنہ، میں تو سدا کا آوارہ مَنش، آوارہ گرد اور بے ترتیب شخص تھا۔ جس کے ٹُوٹے پھُوٹے اور زخم دیتے جسم و جاں کی رَفو گری کرنا اور صراطِ مُستقیم پر گامزن کرنا ہرگز کوئی آسان کام نہیں تھا۔ آج میں یقین سے کہہ سکتا ہُوں کہ میری شریکِ حیات کی تخلیق کا مقصد ہی میری ذات کی تکمیل تھا۔ شادی کے سال بھر بعد ہی ربّ

لم یزل نے ہمیں پری تمثال جڑواں بیٹیوں جیسی نعمت سے نواز دیا۔ گویا جنّت نے میرے گھر کی راہ دیکھ لی تھی۔

اب ہماری شادی کو اٹھارہ برس ہو چکے ہیں اور میں پُورے وثُوق سے کہہ سکتا ہوں کہ جس قدر پُرسکون، شاندار اور محبّت بھری ازدواجی مسرتیں اور گھریلو معاملہ فہمی سے میرے ربّ نے مجھے نوازا ہے اِس کا تمام تر ماحصل میری اہلیہ کی ذات ہے اور میرا ماننا ہے کہ ایسی ہموار اور محبّت بھری زندگی آج کے اِس پُرآشوب دَور میں خال خال ہی لوگوں کو میسّر ہے۔ یہ اِنہی کی اہلیت تھی کہ بچّوں کی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ خُود اپنی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری و ساری رکھا۔ ملازمت بھی کی اور گھرداری کے محاذ پر بھی ثابت قدمی سے جمی رہیں۔ اِس پر مُستزاد یہ کہ مُجھ ایسے رقصِ آوارگی میں محوشخص کی خدمت گُذاری کو بھی اپنا شِعار بنائے رکھا اور انداز ایسا اپنایا جیسے کسی دل کے ہسپتال میں انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں ایک انتہائی اہم مریض کی نگہداشت پر ماموُر نرس اپناتی ہے۔

ہم ۲۰۱۰ء میں وطنِ عزیز کو خیر باد کہہ دینے کے بعد بنکاک میں دو برس تک مقیم رہنے کے بعد ۲۰۱۲ء میں امریکی ریاست ٹیکساس کے شہر ہیُوسٹن پہنچے۔ اِس شہر میں آنے کے بعد مجُھے پہلی بے پایاں مُسرّت تو تیسری بیٹی کی نعمت کی صُورت میں ملی تو میرا آنگن پرستان بن گیا اور دُوسری حیرت ناک خُوشی اِس بات پر ہُوئی کہ اِس شہر میں اُردو بولنے والے پاکستانیوں اور انڈینز کی خاصی بڑی تعداد موجود تھی اور یہاں ادبی اور ثقافتی حوالوں سے خاصی گہما گہمی تھی۔ آج بھی یہاں بہت سی ادبی اور سماجی تنظیمیں ہیں جن کے زیرِ انتظام مُشاعرے اور قومی و مذہبی تہوار خالص دیسی انداز میں پُورے جوش و جذبے سے منائے جاتے ہیں۔

یہاں آئے دن نامور شُعراء کے ساتھ مُشاعروں کا انعقاد ہوتا ہے۔ پاکستان سے بھی نامور ادبی شخصیات، دانش ور اور فنونِ لطیفہ کی دیگر اَصناف سے وابستہ افراد یہاں آتے رہتے ہیں اِسی مناسبت سے ہیُوسٹن کو ''شہرِ ادب'' بھی کہا جاتا ہے۔ اِسی شہر میں جناب احمد مشتاق، جناب عارف امام، جناب مجید اختر، افضال فردوس، تسنیم عابدی، غضنفر ہاشمی اور خالد خواجہ جیسے نامور شُعراء سکُونت پذیر ہیں۔

امریکہ آمد کے بعد جب زندگی میں ٹھہراؤ پیدا ہُوا اور یہاں بیٹھ کر وطنِ عزیز کے حالات پر ایک نظر ڈالی تو سوچ کو ایک نئی اور مثبت جہت ملی۔ چُنانچہ میں نے مُختلف مَوضوعات پر باقاعدہ لکھنا اور اپنی

تحریروں کو سنبھالنا شروع کر دیا۔ اِس موقع پر میں اپنے ایک مُحسن کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں اور یہ ہیں انجمنِ تقدیسِ اَدب، یو ایس اے کے چیئر مین جناب سیّد ایاز مُفتی صاحب۔ آپ مُمتاز شاعر جناب عبدالستّار مُفتی صاحب کے صاحبزادے اور غزل کے بہترین شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ نعت خوانی اور نعت گوئی میں بھی ایک مُمتاز مقام رکھتے ہیں۔ جناب سیّد ایاز مُفتی نے مجُھے یہاں کے ادبی حلقوں میں مُتعارف کرایا اور کئی شعری نشستیں مُنعقد کیں، مجُھے سراہا، میری حوصلہ افزائی کی اور ہمیشہ عزّت و تکریم سے نوازا۔ چُنانچہ، یہاں آباد سبھی سینئر شعُراء نے کُشادہ دلی سے مجُھے اپنے درمیان خُوش آمدید کہا، جو یقیناً اِن کی اعلیٰ ظرفی اور بڑے پن کا ثبوت ہے۔

پھر جب دَورِ جدید کے طاقتور ذریعۂ ابلاغ ''فیس بک'' کے صفحات پر میری نظمیں اور غزلیں ایک تواتر سے اُترنے لگیں تو حلقۂ یاراں کا اِصرار بڑھنے لگا کہ اب اِن شعری جہتوں کو کتابی شکل میں شائع کیا جانا چاہیئے۔ اِس اصرارِ مُسلسل کے لازمی نتیجے کے طور پر ''رقصِ آوارگی'' اِس وقت آپ کے ہاتھوں میں موجود ہے۔

جی ہاں! میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں فنِ شاعری کے اَسرار و رَموز سے نابلد ہوں۔ نہ میں نے عرُوض سیکھا اور نہ ہی لُغت کی موٹی موٹی کتُب میں لفظی تراکیب کھوجنے کا قَصد کیا۔ یہاں تک کہ اُن اُساتذہ کو بھی مایُوسی ہوئی جو مجُھے اپنے سایۂ شفقت کے حصار میں لے کر ایک بہتر اور مقبُول شاعر بنانے کی خواہش رکھتے تھے۔ میں اظہار کی آزادی کو ہر انسان کا بنیادی حقّ سمجھتا ہوں اور یہی سوچ میری شاعری کو بُنیاد فراہم کرتی ہے۔ میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ آزادیٔ اظہار رائے کیلئے شاعری میرا میڈیم ہے جس کے ذریعے میں اپنی فکر و فلسفے کو آسانی کے ساتھ اظہار کے قالب میں ڈھال سکتا ہُوں اور یہی راستہ مجُھے اپنی دھرتی، اپنے تمدّن اور اپنے لوگوں کے ساتھ مُنسلک رکھ سکتا ہے۔ اپنی کتاب کی پذیرائی اور مقبُولیّت میرا مقصد نہیں۔ نہ مجُھے اِس بات کی کوئی فکر ہے کہ میں شعر قبیلے کی کس قطار میں شُمار کیا جاتا ہوں۔ اپنی کامیابی کی سند پہلے ہی میرے پاس موجود ہے اور وہ یہ کہ میں جو اور جیسا سوچتا ہوں اُسے اپنے الفاظ کی مکمل

صداقت کے ساتھ لکھنے اور کہہ دینے پر قادر ہوں اور اہم ترین پہلو یہ ہے میں کسی مُستعار سوچ یا فکر و فلسفے کا پرچارک نہیں ہُوں۔ میری سوچ مُختلف اور غیر اہم حتیٰ کہ غلط بھی ہو سکتی ہے لیکن میں ہر گز کسی سے مُتاثر ہو کر اپنا موٴقف پیش نہیں کرتا بلکہ اپنی ہی حسّیات کے ٹمپریچر پوائنٹ کے زیر اثر رہتا اور الفاظ کو اُن کے اپنے معَانی و مفہُوم کے تابع بہنے دیتا ہوں۔ اِس لئے میرے الفاظ اور میری سوچ سو فیصد میری اپنی فکر کی نُمائندہ ہوتی ہے۔ میں نے جو سوچا، جو سمجھا وہ لکھ کر پیش کر دیا۔ مجُھے اِس بات کی ذرّہ برابر پرواہ نہیں کہ آپ میری کتاب کو مُطالعہ کی میز پر سجاتے ہیں یا ردّی کی ٹوکری میں اُچھال دیتے ہیں۔ اپنے من کی سچّائیاں، اپنا کرب اور اپنے جذبات کو الفاظ کی صُورت میں کاغذ پر اُنڈیلنے کے بعد میں مُطمئن ہُوں۔

بقول عبیداللہ علیمؔ:

بولے نہیں وہ حرف جو ایمان میں نہ تھے
لکھی نہیں وہ بات جو اپنی نہیں تھی بات

صاحبو! میں ایک سیدھا سادا سا لیکن نظریاتی انسان ہوں۔ اِس دُنیا کو جنگ و جدَل، جان لیوا ہتھیاروں، نفرت و تعصّب سے پاک دیکھنے کا آرزُومند ہوں۔ میں خُدا اور ختمُ الرسل ﷺ پر کامل یقین رکھتے ہُوئے یہ سمجھتا ہوں کہ ہر وہ شخص جو میرے مذہبی یا سیاسی نظریات سے اختلاف رکھتا ہے اُسے بھی زندہ رہنے اور دُنیا سے اپنے حصّے کی خُوشیاں کشید کر لینے کا اُتنا ہی حقّ حاصل ہے جتنا کہ مجُھے حاصل ہے۔ ہر نوَع کی نسلی، لِسانی، طبقاتی، مذہبی، سیاسی، تہذیبی اور ثقافتی رسّہ کشی اور نفرت و تعصّب سے ماوراء پُرامن اور بُقائے باہمی پر قائم کائنات میرا خواب ہے اور مجُھے یقین ہے کہ ہم جیسے لوگ تب تک اپنے خواب اپنی نسلِ نَو کو مُنتقل کرنے کی سعی کرتے رہیں گے جب تک ہمارے یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو جاتے اور وہ وقت اب دُور نہیں جب ہم ساری دُنیا کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو جائیں گے کہ انسان کو مارنے کیلئے نہیں زندہ رکھنے اور حیّاتِ تازہ دینے کیلئے منصُوبہ بندی کرنے کی ضرُورت ہے۔ کیوں کہ موت تو بہر حال ایک اٹل حقیقت ہے جس کیلئے کسی کو منصُوبہ بندی کرنے کی ضرُورت نہیں ہے۔

میں عہدِ حاضر کے ایک مُمتاز اور بڑے شاعر جناب مقصُود وفاؔ کا بے حد شُکر گُذار ہوں جنہوں

نے ہمیشہ مُجھ کم علم کو اپنی مَحبّتوں سے نوازا' قدم قدم پر میری حوصلہ افزائی کی اور اپنے قیمتی وقت میں سے وقت نکال کر ''رقصِ آوارگی'' کو پڑھا اور اپنی قیمتی رائے سے سرفراز فرمایا۔

اسلام آباد سے عزّت مآب جناب افتخار عارفؔ صاحب اور میرے دل کے نہایت قریب جناب محبوب ظفرؔ صاحب کا بے حد ممنُون ہوں کہ زیرِ نظر کتاب کے سلسلے میں آپ کا تعاون اور راہنمائی بھی مجُھے ہمہ وقت حاصل رہی۔

میں اسلام آباد ہی سے جناب نیرؔ صدیقی صاحب کا بھی شُکر گذار ہوں جنہوں نے ہمیشہ میرے ساتھ تعاون فرمایا اور ابتدائی طور پر تمام کلام کو جمع کر کے کتاب کی اشاعت میں آسانیاں فراہم کیں۔

ماورا پبلشرز کے چیف ایگزیکٹیو' برادرِ مکرم' جناب خالدؔ شریف کا بے حد شُکر گزار ہوں کہ اُنہوں نے آنکھوں کی آخری سُوئیاں نکالنے کا فریضہ بخوبی سرانجام دیا۔ وہ باکمال شاعر اور غیر مشرُوط مَحبّت کرنے والے دوست ہیں۔ بطور ناشر اُن کے تجربے اور سلیقے کا ایک زمانہ مُعترف ہے۔ خُدا انہیں عمرِ خِضر عطا فرمائے۔

آخر میں ذکر کروں گا اپنے بے حد شفیق دوست اور بھائی سیّد حفیظ مخفیؔ کا جنہوں نے ''رقصِ آوارگی'' کو' اَلف سے لے کر یے تک پڑھا' سنوارا' مرّتب کیا اور آپ تک پہنچایا۔ مجُھے اعتراف ہے کہ اگر مخفیؔ بھائی یہ کام نہ کرتے تو میں شاید ارادے اور وسائل رکھنے کے باوجود بھی نہ کر پاتا۔

اپنے تمام قارئین کیلئے ڈھیروں مَحبّت اور دُعاؤں کے ساتھ

الطافؔ بخاری

ہیوسٹن' ٹیکساس (امریکہ)

یہ کمالِ بے نیازی یہ اَدائے دِلبرانہ
میری جاں! ذرا سنبھل کے، بڑا تیز ہے زمانہ
تُجھے زخمِ دل دکھانے کا خیال روند ڈالا
تیرے دَر پہ ہم نے دیکھا جو ہجُومِ عاشقانہ

حمدِ باری تعالیٰ

مالکِ دو جہاں ، خالقِ جسم و جاں
نُورِ اَرض و سَماء صاحبِ کُن فِکاں
چاند تارے فلک ، یہ زمیں ، کہکشاں
ذّرے ذّرے میں ہے پھر بھی ہے لامکاں
تُو ہی ہر سمت ہے تُو ہی ہے چار سُو
اللہ ہُو ، اللہ ہُو ، اللہ ہُو ، اللہ ہُو

تُو ہی جِن و ملائک کا معبود ہے
لا شریک لہٗ ، تُو ہی مسجُود ہے
گرچہ باہر ہے تُو حدّ ِ امکان سے
پر رگِ جاں سے نزدیک موجُود ہے
ہر نظر میں ہے تُو ہر نظارے میں تُو
اللّٰہ ہُو ، اللّٰہ ہُو ، اللّٰہ ہُو ، اللّٰہ ہُو

جان کر کہ تُو ستّار غفّار ہے
دَر پہ حاضر یہ بندہ سِیہ کار ہے
ہے گناہوں سے لِتھڑی ہوئی زندگی
تیری رحمت کی برسات درکار ہے
بخش دے خاک کو اِک نئی آبرُو
اللّٰہ ہُو ، اللّٰہ ہُو ، اللّٰہ ہُو ، اللّٰہ ہُو

لا الہ الا اللہ

فروغِ نُورِ خدا ' لا الہ الا اللہ
چراغِ راہِ ہُدیٰ ' لا الہ الا اللہ

یہی تو نغمۂ گُل ہے ' یہی صدائے چمن
کہ جُھومتی ہے فضا ' لا الہ الا اللہ

سبھی چراغ ہیں باطل مکانِ ہستی کے
ہے لامکاں کا دِیا ' لا الہ الا اللہ

اگر ہے بحرِ محبّت میں جَذب کی خواہش
وجودِ قطرہ مِٹا ' لا الہ الا اللہ

فقط ہے دردِ دل و جاں جہان کی چاہت
ہے دردِ دل کی دَوا لا الہ الا اللہ

نوائے سازِ شکستہ ہے قلب کی آواز
ہے چشمِ نَم کی صدا لا الہ الا اللہ

غرورِ غیر کو لحظے میں توڑ کر رکھ دے
لگے جو ضربِ خُدا لا الہ الا اللہ

جو حق کی راہ میں حائل ہوئے بُتانِ گماں
بنی وہ کرب و بلا لا الہ الا اللہ

اگر ہے وصل کی خواہش مِٹا دے ہَستی کو
فنا ہے تیری بَقا لا الہ الا اللہ

نعتِ رسول کریم ﷺ

فیضانِ مصطفیٰ ﷺ ہے یہ فیضانِ نعت ہے
ہر روز لکھّا جا رہا دیوانِ نعت ہے

صدقے میں خاکِ پا کے مجھے لفظ ہوں عطا
برپا مِری بھی رُوح میں طوفانِ نعت ہے

شاعر قلم کو چھوڑ کے ظرفِ سُخن سنبھال
رنگِ غزل نہیں ہے یہ عنوانِ نعت ہے

جس کا کلام ہے سبھی مِدحت حبیب ﷺ کی
وہ مالکِ کلام ہی سُلطانِ نعت ہے

کب میرے لفظ آپ ﷺ کے قدموں کو چھُو سکیں
کب میری فکر آپ ﷺ کے شایانِ نعت ہے

بے نام و ننگ تھا مجُھے پہچانتے ہیں لوگ
کیسا یہ میرے شعر پہ احسانِ نعت ہے

افکارِ زِیست ہوں کہ ہوں اسبابِ جسم و جاں
ہر شعبۂ حیات میں امکانِ نعت ہے

مقصوؔد اور ظفرؔ نے بھی یہ راستہ چُنا
آساں نہیں یہ راستہ ' میدانِ نعت ہے

الطافؔ سربلندئ قسمت پہ ہے نثار
جس کو بھی مل گیا یہاں عرفانِ نعت ہے

سیّد مقصود علی شاہ اور ڈاکٹر ظفر اقبال نوریؔ بین الاقوامی شہرت یافتہ نعت گو

اسمِ اعظم

مُجھ کو گہنا گئی میری تیرہ شبی
ناگ وحشت کا ڈسنے لگا ذات کو
جن پہ تھا زُعم' سارے وہ گُرِ زیست کے
علم و عقل و ہُنر
بندگی
شاعری' دوستی
سارے بے رنگ ہو کے فنا ہو گئے
چارہ گر جس سے دامن چُھڑانے لگے
ایسی بے کار' بے آسرا زندگی
بوجھ ذلّت کا دامن سے لپٹا ہُوا

دو قدم پہ تھا، مایُوسیوں کا گڑھا
بسترِ مرگ پر آخری شام تھی
ٹُوٹتی شام میں چشمِ بیمار سے
ایک اشکِ ندامت روانہ ہوا
آخری اشک تھا
اِس سے پہلے کہ بیمار دم توڑ دے
مُعجزہ ہو گیا
ایک آہٹ ہوئی
کوئی جَھونکا ہوا کا
یا خُوشبو تھی وہ
چاند سا جیسے کوئی تھا روشن ہُوا
نام لکھا ہُوا تھا وہ دیوار پر
میں نے آنکھیں مَلیں
نام ظاہر ہُوا
اسمِ اعظم تھا وہ
نامِ احمد ﷺ تھا وہ

مُصطفیٰ ﷺ، مجتبیٰ ﷺ

یعنی جانِ مسیحا

محمد ﷺ تھا وہ

دفعتاً میں نے اُس نام کو چوم کر

اپنی رِستی ہوئی آنکھ پر رکھ لیا

چشمِ بیمار سے اِک جھڑی لگ گئی

اِک مُعطّر سی بارش میں دُھلنے لگے

داغِ ذِلّت، گنُاہ، ساری مایُوسیاں

دستِ رحمت نے ایسا سہارا دیا

زندگی مل گئی

روشنی مل گئی

شُکر تیرا خدا

مرحبا مُصطفیٰ ﷺ

مرحبا مُصطفیٰ ﷺ

نذرانہ عقیدت بارگاہ سیّد الشہدا

(حضرت امام حسین علیہ السلام)

دینِ خُدا کا راز ہے عظمت حُسین کی
ہے معرفت نبیؐ کی مَحبّت حُسین کی

ہے کربلا کی خاک پہ احساں امام کا
ہر ذرّہ مانتا ہے سخاوت حُسین کی

ہَیبت سے کانپنے لگے قاتل حُسین کے
دیکھی جو نوکِ نیزہ پہ جُرأت حُسین کی

تھا نُقطۂ عُروج وہ تفہیمِ دین کا
قرآن تھا خُدا کا تلاوت حسُین کی

گردن کٹا کے بخش دی اسلام کو حیات
پیغامِ زندگی ہے شہادت حُسین کی

اب جس کو وہ عطا کریں جس کو نواز دیں
اُمت رسولؐ کی ہے ولایت حُسین کی

دونوں جہاں میں سُرخ رُو' اُن کے غُلام ہیں
دُنیا بھی ہے حُسین کی ' جنّت حسُین کی

جن کے قصیدہ خوان ہوں ' جِن و ملک ' بشر
الطافؔ کیا بیاں کرے مِدحت حسُین کی

بنتِ کشمیر

ہے سَوا نیزے پر
آفتابِ ستم
آبشاروں سے گِرتا ہے تازہ لہَو
بے حسی کے دُھوئیں کی ہے چادر تنی
چشمِ عالم سے اوجھل ہے شاید ابھی
عہدِ حاضر کی یہ رزمِ کرب و بلا
ہم قدم، ہم قلم، ہم نفس ساتھیو!
کب سے ہے کُند تیغِ حمیّت پڑی
آبروئے سُخن ہم نے خُود بیچ دی
راکھ میں ہیں جو خوابیدہ چنگاریاں
دامنِ دل میں باقی ہیں جو دَھجیّاں

آؤ! مل کر ذرا
آگ روشن کریں
کوئی بے ساز نغمہ یا کوئی صدا
پھر پہاڑوں پہ جا کے پُکاریں ذرا
کوئی گریہ کریں
کوئی ماتم یا نوحہ یا بس چیخ ہو
بے حسی کے دُھوئیں کی یہ چادر چھٹے
چشمِ عالم بھی دیکھے یہ کرب و بلا
جلتے خیموں کی کوئی گواہی ملے
پھر ہلائے ذرا کوئی زنجیر کو
پونچھ کر اَشک کوئی دلاسہ تو دے
بِنتِ کشمیر کو.....

قطعہ

ستاروں سے بھی آگے اِک جہانِ آشنائی ہے
اُسی کو ہم خُدا سمجھیں ' بظاہر جو خُدائی ہے
جسے مستُور رکھنا تھا زمانے کی نگاہوں سے
سرِ بزمِ جہاں ہر سُو اُسی کی رُونمائی ہے

غزلیات

✺

محوِ گردش زمیں ' آسماں رقص میں
آج لگتا ہے سارا جہاں رقص میں

چل رہی ہیں ہوائیں اِدھر سے اُدھر
تُم وہاں رقص میں ' ہم یہاں رقص میں

دیکھ کر جس کو زاہد لگے جُھومنے
مئے کشوں کا تھا وہ کارواں رقص میں

اپنی حالت پہ حیراں تھا خُود آئینہ
ٹُوٹ کر جو گریں کِرچیاں رقص میں

شاعری میں جو رُخ مجُھ کو درکار تھے
کر دیئے اُس نے سارے بیاں رقص میں

جس کو دانش کدہ جان کر ہم گئے
تھے وہاں سارے پِیر و جواں رقص میں

وحشتوں میں رہی اِس طرح زندگی
آگ ہو آب کے درمیاں رقص میں

ناچنے لگ گئے جب سے اہلِ خرد
رہ گیا کیا مزا میری جاں رقص میں

اپنے ہاتھوں سے مَیں نے جلایا چمن
کس خُوشی میں ہیں یہ بجلیاں رقص میں

سانپ جتنے بھی تھے آستیں میں چھُپے
ہو گئے آج سارے عیاں رقص میں

تین اشعار

گرچہ کرنے کو کچُھ نہیں لیکن
پھر بھی کوئی تو کام کر جائیں

یہ جو سادہ ورق ہے ہستی کا
اِس میں رنگِ سُخن ہی بھر جائیں

لوگ جیتے ہیں موت کی خاطر
آؤ! ہم زندگی پہ مر جائیں

✵

ہم کہ رہتے تھے دِلرباؤں میں
اب معلّق ہیں بس خلاؤں میں

سانس لینا بھی ہو گیا دُوبھر
زہر اتنا مِلا ہَواؤں میں

کر کے رکھنا ہے زیر انساں کو
مُک مُکا ہو گیا بَلاؤں میں

آج سُورج سے بَرف گِرتی ہے
آگ لگتی ہے ٹھنڈی چھاؤں میں

بند کمرا شہر کا کیا جانے
کیسا میرا بسَر تھا گاؤں میں

اب تو تفریق مِٹتی جاتی ہے
بادشاہوں میں اور گداؤں میں

ہجر اَٹکا ہوا ہے سانسوں میں
اور ہِجرت پڑی ہے پاؤں میں

✻

عِشق جب تک جان و دل کا رہنما ہوتا نہیں
آدمی انسانیت سے آشنا ہوتا نہیں

جان و دل رکھ کے ہتھیلی پہ وہاں جاتا تو ہُوں
حادثہ یہ ہے کہ کوئی حادثہ ہوتا نہیں

ہو خُدا مَحبوب جس کو بس خُدا مَحبوب ہو
کوئی بھی مَحبوب اُس کا پھر خُدا ہوتا نہیں

بزمِ مَقتل ہے سبھی جلّاد بھی پُرجوش ہے
کس کی باری آئے گی یہ فیصلہ ہوتا نہیں

عِشق بھی سرشار ہے، آتش بھی ہے شُعلہ فِشاں
دیکھیئے ہوتا ہے اب کہ مُعجزہ ہوتا نہیں

ہم محبّت کے ہیں قائل پر غُلامی کے نہیں
سر جُھکاتے ہیں مگر سجدہ رَوا ہوتا نہیں

سوچ لو راہِ جُنوں پر ہمرکابی کے لئے
اِس سفر میں واپسی کا راستہ ہوتا نہیں

آئینے سے کیا سُنو گے کِرچیوں کی داستاں
ٹھوکریں کھانے سے پہلے تجربہ ہوتا نہیں

میں کسے آواز دُوں صحرائے دشتِ ذات میں
لَوٹ آئی ہے نَوا کہ ہم نَوا ہوتا نہیں

رات کی تاریکیاں یُونہی عَبث بدنام ہیں
جُرم دن کی روشنی میں کون سا ہوتا نہیں

زہر سے تریّاق نکلے ' تیرگی سے رَوشنی
دَرد کوئی بھی جہاں میں لادَوا ہوتا نہیں

اہلِ دل الطافؔ تجُھ کو کس طرح پہچانتے
گر جہاں میں شاعری کا سلسلہ ہوتا نہیں

ہم نے جب اُن سے پہلی مُلاقات کی
آخری تھی وہی بات جو بات کی

چاند سُورج ستارے سبھی پا لئے
چھٹ سکی نہ مگر تیرگی رات کی

خُونِ دل سے لکِھی داستانِ سفر
ہم نے کاغذ پہ اشکوں سے برسات کی

شیخ جی جانتے ہیں لڑانے کا فن
کچُھ اِدھر بات کی ' کچُھ اُدھر بات کی

حُسن کے ناز کو جس نے گھائل کیا
کِرچیاں تھیں وہ میرے خیالات کی

زندہ لوگوں سے اُن کے مَکاں چھین کر
ہو رہی ہے سجاوٹ مَزارات کی

جَشن مل کر مَنائیں نہ کیوں موت کا
سوگواری تو بدلے گی حالات کی

تُم نے الطافؔ دل کھول کر رکھ دیا
بات ایسی کہی بس کہ کیا بات کی

✻

محبّت کا وہ سلسلہ کیا ہُوا
تِرا مجُھ سے عہدِ وفا کیا ہُوا

نہ جانے وہ سُورج طلُوع ہو نہ ہو
جو مٹّی کا تھا وہ دِیا کیا ہُوا

کہاں کھو گیا تیرا شوقِ جنُوں
تِرا ذوقِ آتش نُما کیا ہُوا

خزاں تھی مُخالف چمن زار کی
مگر تُجھ کو بادِ صبا کیا ہُوا

نہیں فکر گر منزلیں کھو گئیں
بتاؤ مگر راستہ کیا ہُوا

بہت سُن چکے وَصل کی داستاں
مگر بعد اِس کے بتا کیا ہُوا

بڑا ناز تھا تُجھ کو احباب پر
سِتم تُجھ پہ کس نے کیا ' کیا ہُوا

جو زندہ رہا تو کسے تھی خبر
جو دِیوانہ اب نہ رہا کیا ہُوا

دمِ قیس سے تو بیاباں بسَے
مگر بعد میں شہر کا کیا ہُوا

٭

جب بھی قفلِ شَعور ٹُوٹے گا
تب قَفس بھی ضرُور ٹُوٹے گا

دل شکستہ ہوا تو حیرت کیوں ؟
آئینہ تو حضوُر ٹُوٹے گا

جام و مینا کو بھی میں دیکھوں گا
جب نظر کا سرُور ٹُوٹے گا

میری چاہت کو رَوندنے والے!
تیرا دل بھی ضرُور ٹُوٹے گا

لن ترانی مرا مُقدّر ہے
ہم زبانی سے طوُر ٹُوٹے گا

اُس کی رحمت کو جب بھی جوش آیا
سارا فِسق و فجُور ٹُوٹے گا

رُوبرو اُن کے دل سلامت ہے
جا کے نظروں سے دُور ٹُوٹے گا

جُرم تھا کچُھ ' تو تھا نگاہوں کا
دل مِرا بے قصُور ٹُوٹے گا

جس کو دعویٰ ہے اِستقامت کا
ہو کے محفل میں چوُر ٹُوٹے گا

اُن کے ہاتھوں میں آج پتھر ہیں
کچُھ نہ کچُھ تو ضرُور ٹُوٹے گا

یہ قیامت ہے گویا دُنیا میں
آج اُن کا غرُور ٹُوٹے گا

✿

رابطے کم ہوئے، فاصلے بڑھ گئے بھولے عہدِ وفا وہ بیگانے ہوئے
دیکھتے، دیکھتے اُلفتیں مِٹ گئیں سارے قصے وفا کے پرانے ہوئے

بہرِ تسخیرِ انجم چلے قافلے، کُرّہَ ارض پر دائرے بڑھ گئے
عہدِ نَو کا فسوں ایسا طاری ہوا، رسمِ عشق و وفا سب فسانے ہوئے

کتنی مُشکل میں ہے، کتنا آسان ہے آج ٹکڑوں میں تقسیم انسان ہے
پہلے تنہا ہوا، پھر ہوا دَربدر، گھر بنے پر کہاں وہ گھرانے ہوئے

روشنی کا سفر ہم نے یُوں طے کیا، چاند تو مِل گیا چاند سا کھو گیا
چھینا فرزانگی نے ہے دیوانہ پَن، جام و مینا کو چھیڑے زمانے ہوئے

چشمِ پُرنم ہو یا ہو دلِ مُضطرب، پھُول شبنم کی باتیں جُدائی کے غم
شعر ایسے سُناؤ نہ الطافؔ تُم، لوگ کہہ دیں کہ شاہ جی دِوانے ہوئے

✿

✵

چاہتوں کا ثمر ہم نہیں جانتے
کب کٹے یہ سفر ہم نہیں جانتے

زُلفِ جاناں ہے بکھری جو یہ شام ہے
کیسے ہوگی سحر ہم نہیں جانتے

ہیں مراسم رقیبوں سے بھی آپ کے
ہیں مگر کس قدر ہم نہیں جانتے

ہم سمجھتے ہیں آنکھوں کے سب زاویے
پر یہ تیکھی نظر ہم نہیں جانتے

تیری چشمِ غزل کا ہے یہ تذکرہ
شاعری کا ہُنر ہم نہیں جانتے

اپنا کعبہ ہے صُورت تُمہاری صنم
اس کے دیوار و دَر ہم نہیں جانتے

وہ جو تاریکیوں میں تھے محوِ سفر
اُن کی خیر و خبر ہم نہیں جانتے

تھا بہت دِلنشیں وعظِ شیخِ حرم
کیوں ہُوا بے اثر ہم نہیں جانتے

شوقِ آوارگی زندگی بھر رہا
ہے کہاں اپنا گھر ہم نہیں جانتے

✵

مُجھے آج اِذنِ سفر چاہیئے
کہ سُولی کو پھر میرا سر چاہیئے

کہانی ہے یہ کانچ ، کلیوں کی لیکن
سماعت کو پتّھر جگر چاہیئے

کبھی لَوٹ کر آ بھی سکتا ہے کوئی
سو مجُھ کو بنا لینا گھر چاہیئے

لباسِ خفی میں نہیں کوئی قیمت
تیرے حُسن کو دِیدہ وَر چاہیئے

ملائک تھے سجدہ رَوا میرے آگے
روایت وہ بارِ دِگر چاہیئے

جو آنکھوں میں خوابیدہ خوابوں کو دیکھے
وہ نظریں ، وہ حُسِن نظر چاہیئے

بڑا قیمتی ہے یہ ننّھا سا جگنُو
کوئی تو اُمیدِ سحر چاہیئے

نہیں شاعری سے تو الطاف واقف
تُجھے لکھتے رہنا مگر چاہیئے

می رقصم

برزمین حضرت عثمان مروندی

وہ شوقِ دید کا عالم کہ پیشِ یار ' می رقصم
نہیں کچھ رنجِ رُسوائی سرِ بازار ' می رقصم

اگرچہ مُعتبر ٹھہرا مجُھے وہ جُبّہ و خلعت
سرِ ذوقِ جنُوں کیا وقعتِ دستار ' می رقصم

رہوں کیوں برگِ گُل پہ میں مثالِ قطرۂ شبنم
میرے سر میں تو سودا ہے بہ نوکِ خار ' می رقصم

اَدائے حُسن پہ تُم ناچنا چاہو ' چلو ناچو
رِدائے عشق میں لپٹے گی جب گُفتار ' می رقصم

وہ نُورِ لَم یَزَل ٹپکے ہے اُس چشمِ غِزالاں سے
دمِ گُفتم چلے اَبرو کی تیکھی دَھار ' می رقصم

پسِ دیوار تو سائے بھی محوِ رقص ہوتے ہیں
یہ ضد ہے میری سُورج سے ' سرِ دیوار ' می رقصم

منم الطافِ دَرماندہ کہ خاکِ راہِ دَرویشاں
یہ ہے عِزّ و شرف میرا ' کہیں سرکار ' می رقصم

٭

آشنائے غم ہوئے تو پھر خُوشی دیکھی نہیں
اِس طرح زندہ رہے کہ زِندگی دیکھی نہیں

ایک سجدے کو جُھکے پھر سر اُٹھایا نہ گیا
تُم نے واعظ ایسی طرزِ بندگی دیکھی نہیں

راہ اوروں کو دکھائی خُود اندھیرے میں رہے
جگنُوؤں نے آپ اپنی روشنی دیکھی نہیں

زخمِ دل موجود تھے سینے میں لیکن دل نہ تھا
چارہ گر نے بھی کبھی یہ بے بسی دیکھی نہیں

پھُول کِھلنے پر وہ شاید جھُومتی ہیں اِس لئے
تتلیوں نے تیرے ہونٹوں کی ہنسی دیکھی نہیں

ایک شئے تھی احترامِ آدمیّت بھی یہاں
ہم نے دیکھی ہے مگر وہ اب کبھی دیکھی نہیں

اب سُخن فہمی کہاں ، اہلِ نظر کا دَور ہے
شاعروں کو دیکھتے ہیں شاعری دیکھی نہیں

دیکھ کر طُوفاں کی آمد ہم سفر گھبرا گئے
ساتھیوں نے میرے دل کی بے کلی دیکھی نہیں

محوِ حیرت ہوں کہ ہیں آگاہ سارے ہی یہاں
میں نے لیکن آج تک وہ آگہی دیکھی نہیں

کیا بتاؤں میں اُسے اپنی اُداسی کا سبب
دُور رہ کر گھر سے جس نے شام ہی دیکھی نہیں

بارشوں نے رکھ لیا الطافؔ کے غم کا بھرم
شہر بھر نے میری آنکھوں کی جھڑی دیکھی نہیں

✵

بظاہر اُن کے ہونٹوں پر حکایت اور ہوتی ہے
مگر لہجے میں پوشیدہ شکایت اور ہوتی ہے

یہ شوخ و گرم تحریریں ' سرِ منبر بیاں بازی
ہے شوقِ خُود نُمائی یہ ' بغاوت اور ہوتی ہے

میں گاؤں سے شہر پہنچا تو یہ پہلا سبق سیکھا
مَحبّت اور ہوتی ہے ' ضُرورت اور ہوتی ہے

نیا پیغام دیکھا ہے کوئی اُن کے تبسّم میں
ہنسی میں جو اُبھرتی ہے ' شرارت اور ہوتی ہے

بچھڑ کے یار سے جینا ' جگر کا خُون بھی پینا
ابھی لیکن یہ سُنتے ہیں ' قیامت اور ہوتی ہے

غُرورِ زہد سجدوں میں نہیں انسانیت میں ہے
اَرے زاہد یہ دھوکہ ہے ' عبادت اور ہوتی ہے

سرِ بازارِ کُوفہ نوکِ نیزہ سے صدا اُبھری
مُصلّے بیچنے والو! امامت اور ہوتی ہے

مَحبّت کے فسانے تو بڑے پُرکیف ہوتے ہیں
مگر الطافؔ یہ سچ ہے ' حقیقت اور ہوتی ہے

شوخ آنچل جو اُڑ کر ہَوا ہوگیا
کتنا رنگین رنگِ فضا ہوگیا

رنگِ رُخسارِ عالم نکھرنے لگا
کون گُلشن میں جلوہ نُما ہوگیا

دل جو مدّت سے تھا مُبتلائے بلا
اِک نظر سے ہی اچّھا بھلا ہوگیا

گرمئ دِید سے وہ بھی گھائل ہُوئے
سوچ رکھا تھا کیا اور کیا ہوگیا

مُجھ کو اچھّا لگا اپنا دیوانہ پن
اُن کی محفل میں جب تذکرہ ہوگیا

حُسن سے اُن کی دُنیا حسیں ہوگئی
چاند بھی اب مِرے چاند سا ہوگیا

دیکھتے دیکھتے میرا خُونِ جگر
اُن کے ہاتھوں پہ رنگِ حنا ہوگیا

جب بہار آئی تو سُوئے صحرا چلا
اے دلِ ناسمجھ! تُجھ کو کیا ہوگیا

جن کی آنکھوں سے زاہد شرابی ہوئے
اب سُنا ہے کہ وہ پارسا ہوگیا

جب بتایا کسی نے مِری موت کا
ہنس کے بولے وہ 'اچھّا' تو کیا ہوگیا

ہے بقَا آدمی کی جو انساں رہے
وہ فنا ہوگیا جو خُدا ہوگیا

ہے طبیعت جو سرشار الطافؔ کی
آج اُن سے کہیں سامنا ہوگیا

✵

ترے آنگن میں بھی اُتری جو تنہائی تو کیا ہوگا
ہمیں کھو کر تجھے بھی نیند نہ آئی تو کیا ہوگا

ہمارا دل تو عادی ہے شکست و رِیخت کا لیکن
ترے احساسِ نازک پہ جو چوٹ آئی تو کیا ہوگا

اُداسی دیکھ کر چہرے کی جو آنسو نکل آئے
اگر تُو دیکھ لے زخموں کی گہرائی تو کیا ہوگا

مِرا عنوان ہے کچُھ حسُنِ فطرت کو بیاں کرنا
تصوّر میں ترِی تصویر لہرائی تو کیا ہوگا

چلے ہو دل کو بہلانے حَسیناؤں کی محفل میں
وہاں پر مُنتظر ہوگی جو رُسوائی تو کیا ہوگا

ابھی احساسِ خُوشبُو کا یہ جادو جان لیوا ہے
اگر لی رُوبرو اُس گُل نے انگڑائی تو کیا ہوگا

میرے ذوقِ جنُوں نے شیخ جی گر یہ کرامت کی
خِرد کو عِشق کی پوشاک پہنائی تو کیا ہوگا

جو دیکھا تُجھ کو پروانے نے اپنی شمع گُل کر لی
اِسے یہ عاشقی بھی راس نہ آئی تو کیا ہوگا

جو آغازِ محبّت میں ہمارے نام لِکھی تھی
تُمہاری وہ غزل محفل کو سُنوائی تو کیا ہوگا

ابھی تو نُور کے ہالے تُمہارے گرد رَقصاں ہیں
کبھی ہوگی اندھیروں سے شناسائی تو کیا ہوگا

ابھی تو دل کی ویرانی سے افسُردہ ہوئے ہو تُم
بجے گر غیر کے آنگن میں شہنائی تو کیا ہوگا

مُقیّد کر لیا ہے میں نے بجلی کو نشیمن میں
اگر صیّاد کو تقدیر لے آئی تو کیا ہوگا

تیری تحریر کو الطافؔ ، لوگوں نے سند دے دی
اگر ملتی رہی ' یُوں ہی پذیرائی تو کیا ہوگا

اپنے گناہ دیکھ کے گھبرا کے پی گیا
کعبے میں جا کے شرم سے شرما کے پی گیا

پیتا رہا میں دیر تک ساقی کی آنکھ سے
جو اُس نے دی شراب وہ گھر جا کے پی گیا

تصویر تیری گھول کے حوضِ خیال میں
پھر اِس میں تیرے حُسن کو پگھلا کے پی گیا

میں رقصِ پارسائی کے بہتے ہجُوم میں
لہرا کے پی گیا ، کبھی بل کھا کے پی گیا

پھر یہ ستم ہُوا کہ میں دُنیا میں نہ رہا
پایا جو خُود کو خُلد میں اِٹھلا کے پی گیا

خالی ہُوا جو جام تو پھر میں نے یہ کیا
تصویرِ یار اَشک سے نہلا کے پی گیا

خواب و خیال میں میرے کعبہ ہی تھا مگر
بُت خانۂ حجاز سے ٹکرا کے پی گیا

کچُھ اِس طرح سے محوِ تماشائے ذات تھا
یک رنگئ حیات سے گھبرا کے پی گیا

انکارِ مئے کشی میں تھا سب کا بھرم یہاں
الطافؔ تُو ، تو سب کو ہی دِکھلا کے پی گیا

❋

٭

اگرچہ نگاہوں میں اقرار ہے
مگر اُن کے ہونٹوں پہ انکار ہے

بُھلانا تو مُشکل ہی تھا آپ کو
مگر ، یاد رکھنا بھی دُشوار ہے

عجب کھیل ہے یہ محبّت یہاں
نہیں جیت کوئی ، فقط ہار ہے

پڑی تھی وہاں آرزوؤں کی لاش
سبھی کہہ رہے تھے یہی پیار ہے

جلے دل کو پھر سے میں کیسے جلاؤں
اُنہیں پھر تعلّق پہ اصرار ہے

خُوشی اور غم ہم سفر ہیں مِرے
وہیں گُل کِھلے جس جگہ خار ہے

بھلا راز سے کیسے پردہ اُٹھاؤں
کہ قاتل وہی ہے جو دل دار ہے

ہے معلوم انجامِ اُلفت اُسے
مگر پھر بھی الطاؔف تیّار ہے

✺

خُمارِ آگہی ہے یہ کہ رفعتِ خیال ہے
مُجھے نصیب ہجر میں بھی لذّتِ وَصال ہے

کبھی جو عکسِ آرزو عَیاں ہُوا تو یُوں ہُوا
صَنم کبھی جو سنگ تھا وہ آئینہ مثال ہے

یہ کس سے ہم کلام ہے ؟ ہے کون محوِ گُفتگو ؟
کہ ایک ہی صدا ہے جو' جواب ہے' سوال ہے

مزاجِ شیخؔ مُنقسم ہے ' حُرمتِ شراب میں
جو نہ ملی حرام ہے ' جو مل گئی حلال ہے

یہ زاویہ نظر کا ہے کہ مُعجزہ خیال کا
زوال اِنتہا کا ہے ' عُروج پر کمال ہے

سُکون و اضطراب کیا ؟ یہ حُسن ' یہ حجاب کیا ؟
سبھی فریبِ عکس ہے ' یہ خواب ہے ' خیال ہے

یہ ایک جیسی داستاں جو دفن ہے کتاب میں
ہے آرزو وِصال کی ' تو ہجر کا ملال ہے

٭

اِک چراغِ آرزو پھر سے جلانا ہے مجھے
راستہ تُم کو نہیں خُود کو دِکھانا ہے مجھے

رہزنوں کو دے دیا ہے میں نے تاوانِ سفر
کارواں کو منزلوں تک لے کے جانا ہے مجھے

تار ٹُوٹے ، ساز بِکھرے ، گو ترنّم نہ سہی
نغمہ ہائے زِندگی تو گُنگنانا ہے مجھے

کہکشاں پر چل نہ پائے یہ قدم تو کیا ہُوا
راہِ مَقتل کو ستاروں سے سجانا ہے مجھے

میں شکِستہ دَم ہُوں لیکن یہ شکستِ دل نہیں
اِک نئی ترتیب سے لشکر بڑھانا ہے مجھے

میں وطن سے دُور ہوں پر ماں ہے میری مُنتظر
دَھرتی ماں نے جب بُلایا لَوٹ جانا ہے مجھے

میرے آنسو کب ہیں واعِظ تیری جنّت کیلئے
آتِش دوزخ کو اَشکوں سے بجُھانا ہے مجھے

وقت کی کرب و بلا سے میں نے سیکھا ہے ہُنر
ہار جاؤں گا مگر ' پھر جِیت جانا ہے مجھے

میں نہیں چلتا ہَوائے وقت کی رفتار پر
ساتھ اپنے اِن ہَواؤں کو چَلانا ہے مجھے

تِتلیوں کے رنگ ' خوشبو اور جگنو چاہئیں
اپنے بچّوں کیلئے اِک گھر بنانا ہے مجھے

ہے اندھیرا اِس قدر کہ اب دِیا کافی نہیں
روشنی کے واسطے سُورج جلانا ہے مجھے

نام جب آزُردگی کا شادمانی رکھ دیا
دوستو! اب کِس طرح ، کِس نے سَتانا ہے مجھے

ہر طرف چَسپاں کرو تصویرِ حُورانِ بہشت
شیخ جی کو میکدے میں آج لانا ہے مجھے

سوچ کر کچھ اُس سگِ رَہ سے ہے رسم و راہ کی
اُس گلی میں اب تو اکثر آنا جانا ہے مجھے

جل رہا ہے شہر میرا نفرتوں کی آگ میں
ایک دریائے محبّت پھر بہانا ہے مجھے

جاگ جاؤ اِس بھیانک خواب سے الطافؔ اب
اِک سُہانا خواب تُم کو پھر دِکھانا ہے مجھے

٭

زُباں سے چاہت کے گیت گانا نظر میں عکسِ جمال رکھنا
خزاں کی رُت میں بھی سُرخ پھُولوں کے زَرد پتّے سنبھال رکھنا

سرابِ ماضی کے خواب آمیز دُھندلکوں سے تلاش کر کے
فسانۂ غم سے وَصل کی شب کا کوئی قصّہ نِکال رکھنا

ابھی محبّت نئی نئی ہے' ابھی تو جاری ہیں عہد و پیَماں
بدلتے موسم کے سارے اِمکاں نظر میں فرضِ محال رکھنا

میں شب گزیدوں کا ترجماں ہوں تُمھیں ہیں درکار دُھوپ کرنیں
جو چڑھتے سُورج کا ہو پُجاری تُم اُس کے آگے سوال رکھنا

جو چودھویں شب کو ملنے آوٗ ' تو چاند کا احترام کرنا
تُم ایسا کرنا سیاہ زُلفوں کو اپنے چہرے پہ ڈال رکھنا

کبھی جو زندانِ خُود پرستی میں سانس لینا مَحال ٹھہرے
فصیلِ دل میں ہماری چاہت کا کوئی رَوزن نکال رکھنا

ہے محبّت تو دل میں بڑی آپ کی
پر گوارا نہیں چاکری آپ کی

ہم اگر جاں پہ کھیلے تو اپنی تھی جاں
آپ جیتے رہیں ' زندگی آپ کی

میرے حصّے کی ظُلمت مجُھے دیجئے
پھر جو باقی بچے ' روشنی آپ کی

ہم تو مسرُور ہیں حُسنِ کردار پر
آئینہ آپ دیکھیں ، خُوشی آپ کی

ایک بِسمل کو نظروں سے گھائل کیا
بس یہیں تک تھی ، جادوگری آپ کی

کھیلئے ، رات بھر جی کو بہلایئے
چاند بھی آپ کا ، چاندنی آپ کی

کھیل کا ایسا انجام ہونا ہی تھا
میرا دل تھا مگر ، دل لگی آپ کی

٭

نئے منظر، نئے کون و مکاں تک آ گیا ہُوں
کہاں میری یہ ہستی، میں کہاں تک آ گیا ہُوں

مجُھے اعزاز بخشا تُو نے خُود جنّت بدر کر کے
نکل کر اُس مکاں سے، لامکاں تک آ گیا ہُوں

یہی دو گام ہیں پھر سے ستارے سرِنگوں ہوں گے
ابھی میں چل رہا ہوں، کہکشاں تک آ گیا ہُوں

سنبھالو خُود سے تُم کارِ جہاں اپنا زمیں والو!
وہاں پہ میں نہیں ہُوں، آسماں تک آ گیا ہُوں

جہاں پر عین ممکن ہے کہیں تم چُھپ کے بیٹھے ہو
تعاقب کرتے کرتے اُس نشاں تک آ گیا ہُوں

نشانِ رہ گزُر کوئی نہ کوئی یاد ہے باقی
نہیں اب واپسی ممکن ' جہاں تک آ گیا ہُوں

حیاتِ جاوداں بخشی ہے مجُھ کو مرگِ ہستی نے
میں قطرہ تھا مگر سیلِ رَواں تک آ گیا ہُوں

یہاں سے کچُھ نہیں آگے اگر ہے تو فقط ' تُو ہے
میرے مولا! میں سنگِ آستاں تک آ گیا ہُوں

✻

اِس قدر بے دلی ' کیوں ہے یہ خامشی ؟ آؤ! باتیں کریں
مار ڈالے گی حالات کی بے بسی ' آؤ! باتیں کریں

کوئی افکارِ زندہ ' کوئی فلسفہ ' کوئی اُمید کی اِک کرن دوستو!
کوئی تازہ غزل ' کچھ نئی شاعری ' آؤ! باتیں کریں

آس میں بدلے سب یاس و آزُردگی ' سامنے لاؤ سب اپنی زندہ دلی
موت کے ہاتھ سے چھین لو زندگی ' آؤ! باتیں کریں

کارِ دُنیا سے ملتی ہے فرُصت کِسے، فکرِ فردا نے چھوڑا نہ دامن کبھی
آج قُدرت نے ہم کو جو فرُصت ہے دی، آؤ! باتیں کریں

بھاگ کر موت سے ہم کہاں جائینگے، آئیگی جب تو لازم ہے مرجائینگے
اِس سے پہلے مگر، موت کیوں ہے پڑی ؟ آؤ! باتیں کریں

مئے کدہ ہے مُقفّل تو کچُھ غم نہیں، گھر میں رکھی ہے تصویرِ چشمِ صنم
جاری رکھیں گے ہم شُغلِ بادہ کشی، آؤ! باتیں کریں

✻

مُضطرب ، بے ثمر ، بے اَماں زندگی
خواہشوں کا ہے خالی مکاں زندگی

کچُھ تَصوّر کا ، الفاظ کا کھیل ہے
ہے تماشائے وہم و گُماں زندگی

دَستِ تقدیر و تدبیر کی جنگ میں
رہ گئی بن کے آہ و فُغاں زندگی

کوئی اِس کے نتائج مُرتّب کرے
ہر گھڑی اِک نیا امتحاں زندگی

مُعترض ہے یہ خُود اپنی ترتیب پر
موت ہے چاہئے تھی ' جہاں زندگی

ہے وَرق دَر وَرق دَر وَرق داستاں
ہے نِہاں دَر نِہاں دَر نِہاں زندگی

میں چمن میں تھا ' صحرائے وحشت میں ہوں
کِھینچ لائی کہاں سے کہاں زندگی؟

✵

میرے لب پہ جو حَرفِ سوال آ گیا
اُن کے چہرے پہ رنگِ مَلال آ گیا

حسُن بخشا ہے تُجھ کو مِری آنکھ نے
چھین لُوں گا کبھی جو جلال آ گیا

بات پہلی سی شاید نہ باقی رہے
ایک بار آئینے میں جو بال آ گیا

طائرِ حُسنِ فطرت تو مَدہوش تھا
لے کے صیّاد نظروں کا جال آ گیا

عشق لے کے چلا سُوئے منزل مجُھے
عقل کو راستے میں زوال آ گیا

ایک پتّھر پہ اُگتے ہوئے پھُول کو
دیکھ کر بس تُمھارا خیال آ گیا

چھین کر آنکھ اِذنِ زیارت ملا
بعد مرنے کے حکمِ وصال آ گیا

اُن کے چہرے پہ بھی آج مُسکان ہے
سینۂ سنگ میں بھی اُبال آ گیا

خواہشیں ، خواب کاغذ پہ بکھرا دیئے
شاعری میں مجُھے یہ کمال آ گیا

غم کی بارش میں الطافؔ زندہ رہا
اِک تصوّر تھا جو بن کے ڈھال آ گیا

✺

آرزُوؤں کی ، تمنّا کی کوئی بات کریں
آج کی رات تصّور میں مُلاقات کریں

عین مُمکن ہے خبر چارہ گروں کو بھی ملے
ہم نشیں مل کے جو ہم ماتمِ حالات کریں

پھر نہ لَوٹیں وہ کبھی اپنے مکیں خانوں کو
اُن کے کُوچے میں جو اِک بار بسر رات کریں

مل لیا دُنیا جہاں سے تو یہ حسرت ہے کبھی
ایک دو پل ہی سہی ' خُود سے مُلاقات کریں

مار دیں نظروں سے پھر ہونٹوں سے زندہ کر دیں
حُسن والوں کا ہے کیا کُچھ بھی کرامات کریں

فاصلہ اُن سے ہے اتنا کہ صدا جاتی نہیں
وہ زمیں پر کبھی آئیں تو کوئی بات کریں

کون ساون سے گھٹاؤں کا طلبگار رہے
آو! کُھل کر ذرا آنکھوں سے ہی برسات کریں

اُن ہی لوگوں میں خُدایا تیرا الطاف بھی ہو
تذکرہ رحمتِ یزداں کا جو دن رات کریں

نغمۂ محبّت

اَزل سے ہے دل مُبتلائے محبّت
نہ جانے ہے کیا اِنتہائے محبّت

کبھی تو یہ جینا ہی دُشوار کر دے
دلوں میں وہ گھاؤ لگائے محبّت

یہ گُل رنگ کر دے کبھی زندگی کو
جو خُوشیوں کے نغمات گائے محبّت

فراق اور ملن کے مراحل ہیں اِس میں
جُدائی بھی دے کر مِلائے محبّت

نہیں ہوش رہتا اُسے پھر جہاں کا
جو سر میں کسی کے سمائے محبّت

ہیں بدنامیاں اِس کے پہلو میں پنہاں
مگر راز پھر بھی چُھپائے محبّت

وہ ٹُھکرا کے شاہی پہن لے غلامی
جسے اپنا جلوہ دِکھائے محبّت

جلا کر کرے راکھ یہ زندگی کو
اِسی راکھ میں گُل کِھلائے محبّت

کبھی چھین لے بادشاہوں سے شاہی
فقیروں کو مَسند دِلائے محبّت

خطا تھی اگر تو یہ دونوں طرف تھی
اُسے بھی تو جا کے ستائے محبّت

میرے ساتھ مل کر ذرا دل فِگارو!
لگا دو یہ نعرہ کہ ہائے محبّت

میں واقف نہیں اِس کی گہرائیوں سے
مگر دِل نشیں ہے اَدائے محبّت

پکارے اِسے گر کوئی کربلا سے
تو خنجر گلے پر چلائے محبّت

جو پہنچے کوئی طُور پر دِید کرنے
وہاں لن ترانی سُنائے محبّت

اگر دل کے شیشے کو ہو صاف رکھا
تو بندے کو ربّ سے مِلائے محبّت

ہے سینے میں دل ہم نے بھی پال رکھا
ہمیں بھی کبھی آزمائے محبّت

مُجھے بھی تمنّا ہے الطاف اِس کی
ملے گر کوئی آشنائے محبّت

٭

مُخاطب جب بھی ہوتا ہوں جہاں سے
جواب آتا ہے مُجھ کو لامکاں سے

گواہی کون دے قاتل کی میرے
کوئی تو کھول دے تالے زُباں کے

ہے قدرِ مُشترک دونوں میں انساں
تعلّق ہے زمیں کا آسماں سے

لُٹا جو کارواں تو یُوں لگا کہ
تھے رَہزن کے مراسم کارواں سے

٭

✵

ایسا نہیں کہ ہم کو مَحبّت نہیں رہی
اظہار کی اگرچہ ضرُورت نہیں رہی

مانوُس خار زار سے کچُھ اِس طرح ہُوا
پھُولوں سے دل کو تھی جو وہ رَغبت نہیں رہی

کچُھ مُنصف و امیر سے شِکوہ نہیں مگر
افسوس یہ کہ رسمِ بغاوت نہیں رہی

بیزار مجُھ سے ہو گئے شیخِ حَرَم تو کیا
مجُھ کو بھی اُن سے خاص عقیدت نہیں رہی

احساسِ خُود پرستی بھی کیسا فریب ہے
آئینہ دیکھ کر بھی اب حیرت نہیں رہی

گاہے بگاہے آج بھی رستہ ہیں دیکھتے
گو انتظار میں ترے شدّت نہیں رہی

جب مَصلحت کی برف نے جذبے بُجھا دیئے
شُعلۂ شوق تو رہا ' حدّت نہیں رہی

یہ بے حسی ہے سحر ہے یا کہ جمُود ہے
کچُھ بھی وِصال و ہِجر میں لذّت نہیں رہی

الطافؔ تُو بھی رنگِ زمانہ میں ڈھل گیا
لہجہ نہیں رہا کہ جسارت نہیں رہی

سوچیں ہیں قید ' لب کو ہلانا بھی جُرم ہے
اِس سَرزمیں پہ سر کو اُٹھانا بھی جُرم ہے

ٹُکڑے اُٹھاؤ لاش کے اور گھر کو لے چلو
قاتل کا نام ہونٹوں پہ لانا بھی جُرم ہے

خُوشیوں کی مُستحق ہیں فقط چند ہستیاں
باقی کسی کا ہنسنا ' ہنسانا بھی جُرم ہے

آئین کا تقاضہ ہے ہنس کے قبول کر
میّت پہ اپنی اشک بہانا بھی جُرم ہے

کارِ ثواب ہے یہاں مِدحت یزید کی
لیکن غمِ حُسین منانا بھی جُرم ہے

جتنے چراغ چاہو جلاؤ مزار پر
لیکن سیاہی شب کی مِٹانا بھی جُرم ہے

ناؤ کا ڈُوبنا تو مقدّر میں تھا رقم
گھبرا کے ناخُدا کو بُلانا بھی جُرم ہے

یہ اجتماعی نیند ہے الطاف قوم کی
اِک فرد کو ہِلانا ، جُلانا بھی جُرم ہے

ہم نے جب بھی زبان کھولی ہے
اپنے حصّے کی بات بولی ہے

کتنی لمبی تھی داستانِ ستم
چند لفظوں میں جو سمو لی ہے

اشک شبنم کے چُن ہواؤں نے
موتیوں کی لڑی پرو لی ہے

کتنی کوہِ گراں جوانی تھی
لے کے بانہوں میں ہم نے تولی ہے

بڑھ گئی شامِ غم کی تاریکی
زُلفِ برہم جو اُس نے کھولی ہے

دل کی دھرتی تھی خُون آلودہ
اپنے اشکوں سے ہم نے دھو لی ہے

اتنا بے بس بھنور کو دیکھا تھا
اپنی کشتی وہیں ڈبو لی ہے

شیخ کے مئے کدے میں آتے ہی
زُہد کی کائنات ڈولی ہے

٭

حُسن کو دیکھ کے جو حُسن کی رَغبت نہ کرے
کتنا بے کار ہے وہ دل جو مَحبّت نہ کرے

اُس کی آنکھوں کے شرارے تھے جو بجلی ہے گری
اُس سے کہہ دو کہ دوبارہ یہ شرارت نہ کرے

اُس کی محفل میں نہ جا ' زخم ابھی تازہ ہیں
کیسے دل کو یہ بتاؤں کہ حماقت نہ کرے

اب جو رکھنا ہے بھرم ہم نے تو یُوں کرتے ہیں
میں بھی شکوہ نہ کروں تو بھی شکایت نہ کرے

اُس کی خُوشبُوئے قلم پر مِرے الفاظ فدا
لفظ بانٹے تو مگر ' اُن کی تَجارت نہ کرے

دل تو مائل تھا کہ اِک لمحے میں گھائل ہوتا
کیا کریں وہ جو اِدھر چشمِ عنایت نہ کرے

جو بھی مانگے گا شہہِ وقت نوازے گا اُسے
بس یہ دیوانے کو سمجھا دو بغاوت نہ کرے

✻

میں نے تو دَرد کو سینے میں چُھپا رکھا ہے
جانے کیوں لوگوں نے افسانہ بنا رکھا ہے

تیری آنکھوں سے ہی پیمانہ بھرا کرتے ہیں
ہم کو معلوم ہے ' میخانے میں کیا رکھا ہے

گو ترے ساتھ رہے ' پر تُجھے مل پائے نہیں
جیسے پانی نے کناروں کو جُدا رکھا ہے

چاند سے اُن کی توجہ کو ہٹانے کیلئے
روشنی ہم نے بھی کی ' گھر کو جلا رکھا ہے

وہ حسیں شہر میں کچھ روز تو ٹھہرے گا ابھی
بس یہی سوچ کے گھر اپنا سجا رکھا ہے

میں تصوّر میں ہی دیدار کئے لیتا ہوں
عکس کو آنکھ کے پردے میں چھُپا رکھا ہے

نَظْمِيَّات

مُجھے تُم یاد آتے ہو

فصیلِ شب پہ ماضی کا
کوئی جگنُو چمکتا ہے
تیری مسحُور یادوں کا
مُعطّر سا کوئی جَھونکا
حَریمِ جاں سے ٹکرائے
تو دِل کی رُت بدل جائے
غمِ دَوراں سے گھبرا کے
ذرا جینے کی خواہش میں
شِکستہ دل کے ٹکڑوں میں
میں خُود کو ڈُھونڈتا ہوں جب
مُجھے تم یاد آتے ہو
بہت ہی یاد آتے ہو

آئینِ تیرگی

ہے تقاضائے شبِ مُنتقم
کہ جو باقی ماندہ ہیں چند جگنو
فسادِ صُبح کی علامتیں ہیں
خلافِ آئینِ تیرگی ہے
رہے جو اِمکاں سحر کا باقی
سو، نوچ ڈالو
چمکتی آنکھیں
سُنو!
فجر کا کوئی مؤذن
دَریدہ دہنی سے کام لے کر
جو خواب زادوں کو پھر جگائے

تو کاٹ ڈالو زبان اُس کی
یہ شاہی فرمان عام کر دو
کہ اب یہاں پر، جہانِ شب میں
فقط عقیدے کا راج ہوگا
عقیدہ یہ ہے
کہ آخرِ شب ملے گی جنّت
جو سُرخ نہروں پہ مشتمل ہے
جہاں کھڑی ہیں
وہ شوخ و بے باک
لاکھوں حُوریں
کہ جن کے ہونٹوں پہ
خونِ انساں کی سُرخیاں ہیں

ہم بولیں گے

اظہار پہ بھی پابندی ہے
گُفتار پہ بھی پابندی ہے
غدّار ہے وہ جو بات کرے
جو سوچے وہ بھی کافر ہے
اَے عہدِ ستم کے اہلِ حکم
تُم کتنی زبانیں بند کرو گے، کتنے رستے روکو گے؟
تُم کتنی سوچیں قید کرو گے، کتنے قلم خریدو گے؟
اَے جنگل کے قانون گرو!

تُم کتنے بندے مارو گے؟
شاید تُم کو احساس نہیں
یہ وقت بدلنے والا ہے
ہم دیوانے، ہم فرزانے
تاریک نگر کے سب باسی
ہم سوچیں گے، ہم بولیں گے
ہم چیخیں گے، للکاریں گے
ہم لکھیں گے تُم قاتل ہو
ہم لکھیں گے تُم رہزن ہو
تُم قاتل ہو، تُم ظالم ہو، تُم غاصب ہو
ہم تُم کو بیچ چوراہے میں
اب ننگا کر کے چھوڑیں گے!

وَیلنٹائن ڈے

محبّت کے لئے کچُھ دن نہیں
بس دِل' مخصُوص ہوتے ہیں
بہار آئے' خزاں آئے
کہیں ساون کی بارش ہو' یا جاڑا رُت دسمبر ہو
ہر اِک موسم ہے چاہت کا
محبّت کے تو اِک لمحے میں ایسا سحر ہوتا ہے
کہ جو صدیوں پہ بھاری ہے
محبّت بس محبّت ہے
نہیں ہے قید روز و شب'

نہ محتاجِ بیاں ہے یہ
کسی اظہار کی گرچہ
ضرورت تو نہیں اِس کو
مگر اب رسمِ دُنیا کا
تقاضا بھی نِبھانا ہے
جو سارے لوگ کہتے ہیں
مُجھے بھی گُنگنانا ہے
ہمیشہ کی طرح میری
وفاؤں کا بھَرم رکھنا
کہ میں پھر آج اپنی دیرینہ محبّت کا
اِنہی الفاظ سے اظہار کرتا ہوں
سُنو جاناں! سُنو جاناں!
مُجھے تم سے محبّت تھی
مُجھے تم سے محبّت ہے

✲

یہ سارے خواب تُمھارے ہیں

(اپنی پیاری بیٹیوں امتہُ الشافی، امتہُ الکافی کے حوالے سے کائنات میں بسنے والی تمام بیٹیوں کے نام)

کچُھ خواب تھے میری آنکھوں میں
وہ جگنُو رات اندھیری کے
خواہش تھی آگے چلنے کی
سُورج ہو میری مُٹّھی میں
کِرنوں کو میں تقسیم کروں
کچُھ پھُول کِھلاؤں، خَار چُنوں
دَھرتی کو مُعطّر کر جاؤں
ایسا نہ ہوا، میں کر نہ سکا
دامن میں اُجالا بھر نہ سکا
تنہا تھا میں، سو، ہار گیا
ہر خواہش بدلی، حسرت میں
لیکن وہ خواب تو زندہ ہیں
تُم خواب ہو میری آنکھوں کے

تُم جگنُو رات اندھیری کے
سُورج ہے تمہاری مُٹھّی میں
اب تُم کِرنیں تقسیم کرو
تُم پھُول ہو میرے آنگن کے
تُم راہوں سے سب خار چُنو
دَھرتی کو مُعطّر کر ڈالو
ہیں ساتھ تُمہارے ہاتھ کئی
سجدوں میں گرے کتنے آنسُو
ہر سَمت حِصارِ دُعاؤں کے
جیوَن کے روشن رستے پر
کُچھ اور تو میرے پاس نہیں
اَشکوں سے بوجھل آنکھیں ہیں
یہ خواب میں تُم کو دیتا ہوں
یہ سارے خواب تُمہارے ہیں
اب تُم اِن کی تعبیر بنو!

آئینۂ ذات

دیکھ کر خود کو آئینۂ ذات میں
خُود فریبی کا سُورج پگھل سا گیا
جس کو سمجھے تھے ہم ساحلِ زندگی
وہ تو نقطۂ آغازِ طوفان تھا
منزلیں، فاصلے
سب فریبِ نظر
چشمِ کوتاہ کی سب غلط فہمیاں

جن کو مسکن بنانے کی خاطر چلے
پاؤں چھلنی ہوئے
وہ تو خوابوں، سرابوں کی تھیں بستیاں
نامرادی کی منزل پہ جا کے مگر
ایک عَقدہ کھُلا
عِشق میں ہار جانا ہی تو جِیت ہے
ٹُوٹ جانا ہی
جذبوں کی معراج ہے

تُمہارا موسموں سے کیا تعلّق ہے؟

میرے دل کی زمیں پر
غم کا وہ سیلابِ تُند آیا
کہ ہر اِک نقش دھو ڈالا
خطِ ماضی مِٹا ڈالا
تُمہارے پیار میں بِیتے ہُوئے وہ دن
وِصال و ہِجر کی چُبھتی ہُوئی یادیں
بڑے پُر کَیف لمحے تھے
بڑے پُرسوز نغمے تھے

مُحبّت کے ترانے بھی
رَقابت کے فسانے بھی
تُمہارے ساتھ جیون بھر
سفر کا جو اِرادہ تھا
مِرے ماضی کے دامن میں
جو یادوں کا خزانہ تھا
ہوائے وقت کے ظالم تھپیڑوں نے
سبھی برباد کر ڈالا
چلی حالات کی آندھی
لگائی آگ گردش نے
گُلستانِ تخیّل میں
تھے جتنے پیڑ یادوں کے
سبھی کو راکھ کر ڈالا
کہ اب اِک بے نشاں ماضی
تمنّاؤں کا قبرستان
اور مَیں ہُوں

مگر اِک بات ہے جس پر
مُجھے اب بھی تعجّب ہے
کہ جب بھی رُت بدلتی ہے
یہ بادل گھِر کے آتے ہیں
ہَوائیں رقص کرتی ہیں
نئی کلیاں چٹکتی ہیں
گلُوں میں رنگ بھرتا ہے
کبھی گر، بے دِھیانی سے
کہیں ساون کی بارش میں
ذرا میں غور سے دیکھوں
ہوا کو زور سے سُونگھوں
تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ
اِس موسم کی چھاؤں میں
اِنہی رنگیں فِضاؤں میں
مُعطّر سی ہواؤں میں

کہیں تُم گُنگناتے ہو
چُھپا کر اپنا چہرہ، مُسکراتے ہو
مجُھے پھر سے بُلاتے ہو
بڑی شدّت سے اُس لمحے
مجُھے تُم یاد آتے ہو
بہت ہی یاد آتے ہو
بتاؤ نا!
تُمہارا موسموں سے کیا تعلّق ہے؟

تجدیدِ محبّت کا جواز

(کہانی)

یہی زندہ حقیقت ہے
کہ اِک محدُود مدّت کا
یہاں سب کا بسیرا ہے
کوئی انسان کیسا ہو
وہ زاہد ہو یا عاشق ہو
کوئی شاعر، فسانہ گر
فقیر و بادشہ کوئی
گداگر ہو کہ سوداگر

سبھی نے اِک کہانی کا
فقط کردار بننا ہے
کسی کو پیار مل جائے
تو یہ دَورانیہ کچُھ بڑھ نہیں سکتا
کوئی نا کام ہو جائے
تو مدّت کم نہیں ہوتی
سبھی نے لَوٹ جانا ہے
کہانی چلتی رہتی ہے
جو، آنے والے کل کے
لوگوں کی امانت ہے
مِرے ہَمدم، مِرے ساتھی!
ذرا سوچو!
کہ جب اِک داستانِ مُختصر ہی
حاصلِ سفرِ خراباں ہے
تو کیوں نہ داستاں اپنی

ذرا سی خُوبصُورت ہو
کوئی دَر ماندہ راہی جب
اِسی صحرا سے گُزرے گا
تھکن سے چُور ہو جائے
بہت مایُوس ہو جائے
تو اُس کی بھیگتی آنکھیں
کسی افسانۂ ماضی کے
بوسیدہ وَرق میں جو پناہ ڈھونڈیں
کہانی میں تُمہارے اور مِرے
کردار تک پہنچیں
تو آنکھیں مُسکرا اُٹھیں
وہ دَر ماندہ مُسافر پھر
نئے خوابوں کی راہوں پر
جوازِ زندگی پا لے
میرے ہَمدم!

مجُھے اِس داستاں میں
زندگی کے رنگ بھرنے کو
فقط تیری ضرُورت ہے
یہی کچھُ سوچ کر میں نے
تُجھے پھِر سے بُلایا ہے
کہ آؤ! ہم
گزشتہ فیصلہ تبدیل کرتے ہیں
محبّت کر ہی لیتے ہیں

رقصِ آوارگی

عِشق نے جب کبھی مُجھ کو آواز دی
میں چلا دَار پر اور کبھی طُور پر
حُسن نے ناز سے جو پُکارا مجُھے
سازِ اُلفت پہ دل گُنگنانے لگا
میں چلا تو مِرے ساتھ نغمے چلے
آئینہ دیکھ کر دم بخُود رہ گیا
چِلمنوں میں کھنکنے لگیں چُوڑیاں
چاند تارے فلک سے جو ٹُوٹے کبھی
میں نے محبوب کی مانگ میں بھر دیئے
مَوسمِ گُل پہ میں نے جو لکھی غزل
اِن بہاروں کو بھی ترجُماں مل گیا
پُھول صحراؤں میں جس قدر ہیں کِھلے
میرے پاؤں تلے کے وہ تھے آبلے
میری نوکِ قلم کا یہ اعجاز ہے

ایک بے جان پتّھر جو تاریک تھا
چاند کہہ کر اُسے داستاں بخش دی
آئینے کا تحیّر مِرے دَم سے ہے
حُسن میں یہ تکبّر مِرے دَم سے ہے
عِشق کا یہ تصوّر مِرے دَم سے ہے
میری ٹھوکر سے ہر تخت تاراج ہے
میرے سر پر ستاروں بھرا تاج ہے
آسماں مجُھ سے بس ایک دو گام ہے
کہکشاں میرے رستے کا ہی نام ہے
رات بیتی کبھی میکدے میں مِری
آنکھ کھولی تو کعبے کی دہلیز پر
مُجھ کو مسند پہ بھی ہے بٹھایا گیا
تو کہیں پر میں زندہ جلایا گیا
آزمایا مُجھے جب بھی تقدیر نے
خُون مانگا جو تَقدیسِ تحریر نے
پھُونک ڈالا وہیں مَنصبِ ذات کو
چھوڑ کر عزّتِ حرفِ سادات کو

میں نے بخشی ضیاء ہر سیہ رات کو
کربلاؤں کی جانب اُٹھے جو قدم
کارواں نے قیادت مجھے سَونپ دی
نام کو تیرے پہچان میں نے ہی دی
جاں بچانے کو بھی جان میں نے ہی دی
میں گزُرتا گیا منزلیں رَوند کر
راز داں ہُوں میں سارے جہاں کا مگرٗ
اپنے رازِ جنُوں سے رہا بے خبر
میری پہچان ہے میری دیوانگی
میرا مَسلک رہا رقصِ آوارگی
ہے حقیقت کہ اِک دن بِکھر جاؤں گا
یہ نہ سمجھے کوئی کہ میں مَر جاؤں گا
کون جانے کہ پھر میں کِدھر جاؤں گا
موت کی حد سے آگے گزر جاؤں گا

16 دسمبر

(سانحہ اے پی ایس پشاور کے تناظر میں)

مانگ لیلائے وطن کی ہے سجائی خُون سے
ننّھے پھُولوں نے دیا ہے یُوں خراجِ کربلا

دُکھ مجُھے انساں کے مرنے پر بھی ہوتا ہے مگر
آج میں انسانیت کی موت پر ہُوں رو رہا

شِکوہ قاتل سے نہیں اہلِ حکَم سے ہے مجُھے
سانپ جن کی آستیں کا میرے بچّے کھا گیا

تکمیلِ ذات

تعمیرِ ذات مُمکن ہے
مگر! تکمیل نا مُمکن
ترا اسرمایۂ حاصل شکستِ ذات ہی تو ہے
ہمیں بس زاویۂ فکر کو
تبدیل کرنا ہے
فقط "اِک" بُت گرانا ہے
کہ جب یہ سومناتِ خُود فریبی
ٹُوٹ جائے گا
فرشتے آ رہے ہیں جو تعاقب میں
وہ اِن ٹُکڑوں سے جنّت میں
کوئی روشن محل تعمیر کر دیں گے
کہ تیری کرچیوں سے ہی
تری تکمیل مُمکن ہے

خِزاں کی بارش

خِزاں رُت کی گھٹائیں
اور مسلسل تیز بارش
جس قدر بھی تیز ہو لیکن
یہ کھڑکی توڑ کر
کمرے کے اندر آ نہیں سکتیں
تعجّب ہے
گزُر کے کس طرح سینے سے
دل کے اندر
آن ٹھہری ہیں

خواب

میں کہ خوابوں خیالوں کا ہُوں آدمی
خواب جیون مِرا
حاصلِ زندگی
اوڑھنا اور بچھونا یہی خواب ہیں
جانتا ہوں کہ تعبیر مُمکن نہیں
چاہتا ہُوں بچالُوں میں پھر بھی اِنہیں
نَسلِ نَو کے لئے
گرمئ شُعلۂ وقت کی تاب سے
خواب جل جائیں گے

خواب مر جائیں گے
اِس لئے میں اِنہیں
لکھ کے کاغذ پہ اِک نظم کی شکل میں
اور دے کے کفن

جَذب و احساس کا
بعدِ تدفین گھرے تفکّر میں ہُوں
کس طرح پہنچ پائے گا خوابوں تلک
آنے والا زمانہؑ
مِری نَسلِ نَوؑ
اِس لیے اِک وصیّت ہے احباب کو
ایک کَتبہ یہاں اِیستادہ رہے
جس پہ لکھا ہو یہ
کہ یہاں دفن ہیں
خواب الطافؔ کے

سَاون اور سَنّاٹے کے بیچ

میری خاموشیوں کو جو
شکستِ فَن سمجھتا ہے
غلط فہمی
اُسے یہ خُوش گمُانی
صَد مُبارک ہو
قلم خاموش ہے میرا
تو اِس پر یہ تحیّر کیوں
کہ یہ افسانۂ ہستی کا
اِک ٹھہرا سا مَنظر ہے
ابھی صفحات باقی ہیں
جسے تُم جِیت کہتے ہو

یا میری ہار کہتے ہو
یہ بس نظروں کا دھوکہ ہے
کہ پُرآشوب جنگل میں
جنُوں کا کارواں بھٹکا نہیں ہے
بس، کسی پُرسوز لمحے کی
گھنی چھاؤں میں
دَم لینے
گھڑی دو آن ٹھہرا ہے
سفر ہر طور جاری ہے
فقیرانہ صدائیں کب؟
سگِ بازار کی آوارہ غُرّاہٹ سے دَبتی ہیں
ہمیں ہر حال چلنا ہے
بہت اچھّی طرح معلوم تھا ہم کو
کہ اِن راہوں میں ہر جانب
فقط کانٹے ہی ہوتے ہیں
مگر یہ رہ گذارِ عشق کے راہی

تو خُود پھولوں کو ٹُھکرا کے
بہ نوکِ خار چلتے ہیں
یہ خُود کو خُود جَلا کے موسمِ گُل میں
گُلستاں کے مکینوں کو
نئے انداز سے جشنِ چراغاں کا
ہُنر تقسیم کرتے ہیں
یہ خُود راہوں میں لُٹتے ہیں
شکایت بھی نہیں کرتے
مُجھے اپنے حَریفوں کو
یہی پیغام دینا ہے
کہ جیسے کربلا کے ختم ہونے پر
نیا اِک کارواں ترتیب پاتا ہے
تو ساون اور سنّاٹے کے بیچوں بیچ
آ ٹپکا ہے گہرے حَبس کا
جو مُختصر مَوسم

اِسی شامِ غریباں کے تَعفّن خیز لمحوں میں
تُم اپنا عارضی جشنِ فتح
ترتیب دے ڈالو
کہ میں اِس مُختصر وقفے میں
پھر لَوح و قلم کو اِک نئی تحریر کا
عُنوان دیتا ہُوں

فاختہ

میں
کہ صدیوں سے انسان کے ساتھ ہُوں
امن کا، دوستی کا نشاں، فَاختہ
تُم ہی بتلاؤ کیا میں نے مانگا کبھی
روٹی، کپڑا، مکاں؟
کُچھ نہیں چاہیے
مُجھ کو اپنے لئے
جب بھی مانگا خُدا سے
جہاں کے لئے
امن اور آشتی، زندگی، دوستی
آج مغمُوم ہُوں
گھر میں محصُور ہُوں
گھونسلے میں ہیں بچّے بھی سہمے ہوئے
ہے فضاؤں میں میزائلوں کی گرج

لیس بارُود سے، آگ سے ہیں بھرے
کتنے جنگی پرندے ہیں چاروں طرف
گھونسلا میرا، اِن کے نشانے پہ ہے
بچّے مرجائیں گے
میں اُجڑ جاؤں گی
میں کہ صدیوں سے انسان کے ساتھ ہوں
امن کا، دوستی کا، نشاں فاختہ
دوستو!
چونکہ ہاتھوں سے محرُوم ہُوں
جوڑ کر زخمی پر
التجا ہے مِری
میری پہلی تمنّا، یہی آخری
آؤ! مل کر ذرا
جنگ کو روک لیں

End Of The Game

(عالمی وباء کورونا کے تناظر میں)

جب ابنِ آدم زمیں پہ اُترا
تو اِس سیّارے کی ساری مخلوق اِس کے زیرِ عتاب آئی
گھمنڈ، طاقت، شعور، حِکمت
چلایا سکّہ، ہُنر دکھایا
زمیں پہ قبضہ، فضا پہ ڈورے
کہ سب "مقامی" غُلام ٹھہرے
کسی کو دُشمن بَلا، سمجھ کر
کسی کو آفت، وَبا بتا کر
سبھی کو کُچلا، سبھی کو رَوندا
خُود ہی کو افضل قرار پایا

وہ چند باغی جو بچ گئے تھے
کسی پناہ گاہ میں چُھپ گئے تھے
زمیں کے وارث' بلا کے سرکش
نئے ارادے' نئے ہُنر سے
وہ بن کے پھر سے عظیم لشکر
زمیں کا قبضہ چُھڑا رہے ہیں
جو کل کے فاتح تھے' عارضی تھے
پلٹ رہے ہیں وہ گھر کو واپس
وہ یعنی جنّت میں جا رہے ہیں

برما کے مسلمانوں کے نام

(پاکستانی حکمرانوں کا پیغام)

اے بَرما کے مسلمانو!
ہمیں آواز مت دینا
کوئی تُم کو جلاتا ہے
تُمہارا خُوں بہاتا ہے
تُمہاری آبروئے ریزہ ریزہ
مرد وزَن بچّوں کی لاشوں کو
بِنا گور و کفن کوئی سمندر میں بہاتا ہے
ہمیں معلوم ہے سب کُچھ
کہ تُم پہ کیا گُزرتی ہے

مگر ہم کیا کریں اِس کا
کہ ہم اک ایٹمی طاقت
بہت مُمتاز ہیں تُم سے
بہت مصرُوف رہتے ہیں
تُمھیں تو صرف مرنا ہے
ہمیں کچُھ کام کرنے ہیں
ہمیں غم ہے جہاں بھر کا
یہ مانا تم بھی انساں ہو
یہ بھی سچّ ہے مُسلماں ہو
مگر چھوٹے سے خطّے کے
جہاں سونے کی کانیں ہیں
نہ کوئی تیل کے چشمے
نہ کوئی ڈیل ہے اپنی
تُمھاری سرحدیں بھی
چین و تُرکی سے نہیں ملتیں

ہمیں تُم سے غرض کیا ہے؟
ابھی قومی اسمبلی میں
ہمیں یہ بحث کرنی ہے
کہ عیدیں کتنی ہوں گی؟
چاند کو کیسے دکھانا ہے
کسی مُفتی سے جا کے
اِس پہ فتویٰ بھی لکھانا ہے
اگر امریکہ والے فوج کو واپس بُلائیں گے
تو ہم اپنا بجٹ کیسے بنائیں گے؟
ہمیں اسلام و بِدعت میں بھی کچھ تفریق کرنا ہے
ابھی یو این او جانا ہے
کسی شیخِ حرم کے فیصلوں کا مان رکھنا ہے
کہیں پہ وَرلڈ بنک کے ضابطوں کی بھی
ہمیں تجدید کرنا ہے
ابھی ہمسایہ ملکوں سے تجَارت بھی بڑھانی ہے

ابھی یورپ میں جا کے امن کا پرچار کرنا ہے
اگرچہ ملک میں اپنے بہت سارے وسائل ہیں
مگر بَرما سے ہٹ کے بھی
ہمارے کچھُ مسائل ہیں
الیکشن بھی تو آنے ہیں
ٹکٹ تقسیم کرنے ہیں
کسی کو چھوڑ دینا ہے' کسی کو پھر بُلانا ہے
کہیں چھوٹی جماعتوں کو نیا" سبزہ "دکھانا ہے
کبھی الطاف بھائی کو سُونامی سے ڈرانا ہے
ابھی مولانا کو بھی کچھُ دے دِلا کے رام کرنا ہے
اگر جولائی کے آخر تلک ہم کو
ملا کچھُ چین سے قرضہ
تو پھر اگلے مہینے جشنِ آزادی منانا ہے
تو اے بَرما کے مظلُومو!
جو چاہو تُم وہ کر جاؤ

رہو زندہ یا مر جاؤ
ہمیں آواز مت دینا
بھلا اقبالؒ کے شاہیں
فقط چند لاکھ جلتے برَمیوں کی
بے کفن لاشوں کو کیا دیکھیں
کہ ہم تو
نیل کے ساحل سے لے کر کاشغر تک
ایک لامحدود اُمت کے
یک و تنہا محافظ ہیں!

اعترافِ حقیقت

میری جاں یہ حقیقت ہے
مُجھے تم سے محبّت ہے
تُمہارے بِن میرا جیون
تمنّاؤں سے عاری ہے
خیالوں کا سِیہ آنگن
تُمہارے پیار کی شمع سے روشن ہے
میری جاں یہ حقیقت ہے
کہ میری آرزؤں کے جہنم زار صحرا میں
تُمہارے دَم سے ٹھنڈک ہے
میں تُم کو چاہتا ہوں، سوچتا ہوں، پیار کرتا ہوں
مگر تُم کو شکایت ہے
کہ اظہارِ محبّت کس لیے میں کر نہیں پاتا
تُمہارے حُسن کی خوشبُو کو جب محسُوس کرتا ہوں
تو پھر اِس کو کسی رنگیں غزل میں ڈھال کر

تُم سے نہیں کہتا
تُمہاری زُلف کو، رُخسار کو، چشمِ غزالاں کو
کسی بھی شعر میں افسانچے میں کیوں نہیں لاتا
سُنو جاناں!
غلط فہمی جو تُم کو ہے اُسے تم دُور کر لینا
میں تُم سے پیار کرتا تھا
میں تم سے پیار کرتا ہُوں
یہ میری شاعری تو
زندگی کا ایک پہلُو ہے
کہ افسانوں میں شعروں میں
تو لفّاظی ہی ہوتی ہے
کئی موضُوع بدلتے ہیں
کئی عُنوان ہوتے ہیں
مگر تم تو کتابِ زندگی کے ہر وَرق پر
یُوں نُمایاں ہو
کہ اس کا حرفِ اوّل بھی

تمھی ہو، سطرِ آخر بھی
مجھے تسلیم ہے جاناں!
کہ اب شاید وہ گرمئ اظہار نہ ہو
میرے لہجے میں
تمھیں جس کی تمنّا ہے
مگر اِس کا سبب یہ ہے
کہ ہم تم دونوں جس دُنیا میں رہتے ہیں
وہیں پر اور بھی لاکھوں کروڑوں لوگ رہتے ہیں
اُسی خالق کے پروَردہ
اُسی مالک کے بندے ہیں
یہ دھرتی، آسماں، قوس وقزّح
جگنو، ستارے، پھول اور شبنم
غرض کہ دستِ قُدرت نے
دیا ہے جو بھی انساں کو
وہ سانجھا ہے
برابر ہے

سبھی کا اِس میں حصّہ ہے
اِنہیں اظہار کا حق ہے
سبھی کو پیار کا حق ہے
مگر یہ بدنصیبی ہے
کہ ہم تُم
آج جس دَورِ سیاہ میں سانس لیتے ہیں
وہاں اب وقت کے ظالم خُداؤں نے
خُدائے عزّ و جل کی سرزمیں پر
اپنے خُونی پنجے گاڑ رکھے ہیں
ستم کی داستانیں ہیں
کہ رُوحِ آدمیّت کانپتی ہے
حشر برپا ہے
کہیں پہ تار تار آنچل
کہیں پامال ہے عصمت
شرافت مُنہ چھُپاتی ہے
محبّت بَین کرتی ہے

یہاں انصاف بِکتا ہے
یہاں مظلُوم روتے ہیں
مگر وحشی دَرندے دَندناتے ہیں
بنامِ دین و مَسلک خُوں بہاتے ہیں
میں جب بھی دیکھتا ہوں یہ
کراہیّت بھرے مَنظر
تو مُجھ میں خواہشِ اظہارِ اُلفت
مَر سی جاتی ہے
مِری رُومانویّت چھین لی ہے اِن مناظر نے
مُجھے تُم مُعاف کر دینا
تخیّل کے گھنے جنگل میں جو میں کھوسا جاتا ہوں
یہ شاید میری فطرت ہے
وگرنہ یہ حقیقت ہے
مُجھے تُم سے مَحبّت ہے
مُجھے تُم سے مَحبّت ہے

تفریقِ صِدق و کَذب

سرِ دَربارِ ظُلمت جو
سفیرِ روشنی معتُوب ٹھہرا ہے
دلیلِ آمدِ صُبح ہے
ہواؤں نے چراغِ ناتواں کو
مُشترکہ ہدَف کہہ کر
شکستِ شب کا اعلامیہ جاری کر دیا ہے
رَواں پانی پہ قابض
اِبلیسی خلافت کے نگہبانو!

تُمھیں کس نے کہا ہے کہ
میں تشنہ ہُوں
مِری خواہش پہ تقدیریں
پلٹ کر جا بھی سکتی تھیں
مگر شاید
نِشاں جو قافلۂ حق کا رَہبر تھا
کہیں دُھندلا کے رہ جاتا ہے
میں مَنزلِ حق پرستوں کی
ذرا آسان کرنے کو
فقط تفریقِ صدق و کَذب کی خاطر
بَہتّر ساتھ لایا ہوں
فتح کا واضح نقّارہ
یہ اعلانِ شہادت ہے
میرے خیموں کا جل جانا
صداقت کی علامت ہے

مسیحاؤں کے نام

(عالمی وبا کورونا وائرس سے نبرد آزما ڈاکٹرز، نرسز اور دیگر پیرا میڈیکل اسٹاف کے نام)

زندگی، موت ہیں آمنے سامنے
اور اس جنگ میں
زندگی کے مُحافظ، سپاہی ہو تُم
بِلبلاتے ہوئے، جاں سے جاتے ہوئے
ہر مُصیبت زَدہ کی ہو اُمید تُم
ٹُوٹتی سانس کو جوڑنے کا یقیں
تُم مسیحا ہو، رکھ کے ہتھیلی پہ جاں
چِھین لو موت کے مُنہ سے پھر زندگی
ٹُوٹ جائے گا طُوفان کا حوصلہ
جیت جاؤ گے تُم
موت کی سرحدوں پر کھڑے غازیو!
تم سلامت رہو، تُم سلامت رہو

کورونا ہار جائے گا

(عالمی وباء کورونا کے تناظر میں لکھی گئی نظم)

سفر میں زندگانی کے
ہزاروں موڑ آتے ہیں
کبھی گُلزار راہیں ہیں، کبھی ہیں زیرِ پا کانٹے
کبھی تو جلوۂ جاناں سے دُنیا رشکِ جنّت ہے
کبھی تنہائیاں اتنی کہ سایہ تک گریزاں ہو
محبّت کی مُسافت میں یہ سب رَستے کے منظر ہیں
محبّت مر نہیں سکتی، محبّت مِٹ نہیں سکتی
محبّت رُک نہیں سکتی
مگر اِک خاص لمحے میں یہ اپنا زاویہ تبدیل کرتی ہے
نکل کر ذات سے باہر، ذرا اِس رنگ کو دیکھو
یہ دھرتی، چاند، سُورج، کہکشاں اور گُلستاں سارے
پھر اِن سب سے بڑھ کر ہستیٔ انسانِ خاکی ہے

یہ سب مظہر ہیں قُدرت کے
نشاں ہیں سب مَحبّت کے
خُدا کو پیار ہے اِن سے کہ یہ سب اُس کی دُنیا ہے
میں ہُوں اِک بندۂ فانی
مگر مَحبُوب کی آنکھوں کی نَمنا کی
مِرے سب فیصلے تبدیل کرتی ہے
مُجھے بے چین کرتی ہے
تو پھر کیسے یہ ممکن ہے؟
کرم اور رحم کا خالق، جو ہے سر چشمۂ الفت
خُدا جو خُود مَحبّت ہے
وہ کتنی دیر دیکھے گا تڑپتا اپنے مظہر کو؟
نہیں ویران رکھے گا وہ بازار و مساجد کو
خُدا کو رحم آنا ہے
خُدا کو رحم آئے گا
فقط تُم حوصلہ رکھنا
ذرا سا فاصلہ رکھنا

جُھکا کے سر کو سجدے میں
خُدا سے رابطہ رکھنا
مَحبّت جوش مارے گی، زمیں پھر مُسکرائے گی
بلائیں بھاگ جائیں گی، بہاریں لَوٹ آئیں گی
میں پھر سے نظم لکھوں گا
یہ دُنیا گنگنائے گی
اگرچہ رات گہری ہے، مگر یہ بِیت جائے گی
کورونا ہار جائے گا، مَحبّت جیت جائے گی

میں پہلا معتُوب تو نہیں ہوں

یہ میری پُر خطا آنکھیں
مُعیّن زاویوں سے ہَٹ کے
بھی کچُھ دیکھ لیتی ہیں
مجُھے بھاتا ہے رنگِ سُرخ
بس دَستِ حنائی میں
عُروسی پیرہن میں
یا کبھی پھُولوں کی صُورت میں
میں مُطمئن ہُوں
کہ جسم میرا بھی
سنگ باری سے آشنا ہے
بہت ہے مانُوس دستِ قاتل

سوال ہے قاضئ زماں کا
تیرا مقدّر ہے ریگِ صحرا کا یہ تسلسل
تو تیری گُستاخ پُتلیوں پر
ہرے درختوں کے خواب کیوں ہیں؟
میں جانتا ہوں
میں پہلا معتُوب تو نہیں ہوں
صلیب پر اپنی آخری شب
میں پُر یقیں ہُوں
مِرا خُدا جو کہ دیں فروشوں کی قید میں ہے
وہ دیکھتا ہے، وہ آئے گا اور
زخمی آنکھوں سے ریت چُن کر
مِری سَوالی ہتھیلیوں میں
ہَرے درختوں کے بِیج دے گا

جنگ

زمیں سے لاوا اُبل رہا ہے
فضا سے آتش برس رہی ہے
پرندے جنگل میں سہمے سہمے
بہت پریشاں ہیں
مچھلیاں بھی تہہِ سمندر
زہر آلودہ ہَوا کے جھونکے
کہ آکسیجن بھی گھٹ رہی ہے
''اے جنگ بازو! دُکان دارو!''

ذرا یہ سوچو

زمیں پہ انساں رہا نہ باقی

تو کس کو بیچو گے اسلحہ تُم ؟

تُمھاری خُود ساختہ سیاست

محض، خیالی سی دشمنی یہ

جو اپنے ہاتھوں

خُود اپنے بچّوں کا ہی مقدّر

خُود اپنے ہاتھوں جلا رہی ہے

گلُاب سارے سُکھا رہی ہے

زمیں کو دوزخ بنا رہی ہے

آرزوئے بندگی

خواہشوں کے سمندر میں ڈُوبا ہُوں
سر سے پاؤں تلک
لغزشوں اور خطاؤں کا اِک بوجھ ہے
زندگی ایک خوابِ پریشان ہے
بے ہُنر' بے عمل' ، پُرخطا' بےنَوا
بندگی کی حقیقت سے نا آشنا
ہو کے مجبُور تاریکئ ذات سے
آج گھبرا کے غم کی سیاہ رات سے

مَعصیّت سے بھرے

ہاتھ ہیں کہ کثافت سے لتھڑے ہُوئے

چَھلنی چَھلنی سایہ دامنِ التجا

رِستی آنکھوں میں لے کے اُمیدِ کرم

بارگاہِ حقیقی میں اے کبریا!

لے کے دستِ دُعا' ہے کھڑا یہ گدا

سب جہانوں کے مالک' اے خالق خُدا!

رازقِ دو جہاں' مالک کُن فِکاں

تُو رحیم و کریم و مُصوّر بھی ہے

تُو کہ زندہ ہے' اوّل بھی' آخر بھی ہے

مانتا ہوں تو جبّار و قہّار ہے

جانتا ہوں مگر

دَر پہ آئے ہُوئے عاصیوں کے لئے

ابرِ رحمت ہے' ستّار' غفّار ہے

اے جنّ و ملائک' بشر کے خُدا!

جانِ ارض و سماء!

خُشک وتر کے خُدا!

تُو جو چاہے تو صدیوں سے سُوکھے ہُوئے
بے ثمر خشک پیڑوں کو پھل دیتا ہے
آنِ واحد میں موسم بدل دیتا ہے
یہ زمیں ہے تِری، آسماں ہے تِرا
الغرض یہ کہ سارا جہاں ہے تِرا
موت کو بھی کبھی زندگی بخش دے
تُجھ سے مانگے جو کُچھ تو وہی بخش دے
کوئی بخشش کا طالب ہو تُجھ سے اگر
مانگ لے کوئی جنّت یا پھر مانگے زَر
کوئی خالی نہیں تیرے دَر سے گیا
بس یہی سوچ کر میں بھی ہُوں آ گیا
میری خواہش مگر مُختلف ہے ذرا
مُجھ کو حُورانِ جنّت نہیں چاہیئں
آرزُوئے شرابِ طہُورا نہیں
فُقر و شاہی، نہ کُچھ شان و شوکت کی چاہ

جُستجوئے امامت، ولایت نہیں
آدمیّت کا احساس ہے مر گیا
مَنصبِ عَبد جو مُجھ سے چھینا گیا
مُجھ کو میرا وہی مَرتبہ چاہیئے
عزّتِ اشرفِ الخلق لَوٹا دے پھر
پُوری کر دے مِرے دل کی یہ آرزُو
مُجھ کو انسان بننے کی ہے جستجُو
اپنا بندہ بنا دے مجُھے اے خُدا!!
اپنے دَر پہ جُھکا دے مجُھے اے خدا!!

میں اِس لہُو کا خِراج لُوں گا

میں تو بہاروں کا نَغمہ خواں تھا
چمن کے پھُولوں کا اِک شیدائی
امن کا' چاہت کا' ایک طالب
گُلاب پتّی پہ ڈھلکے شبنم
تو اُس کو بُلبُل کے اَشک کہتا
خیال و مَستی کا ایک شاعر
وفا کی نگری کا اِک مسافر

میرا قلم جب رَواں ہُوا تو
مَحبّتوں کے ہی گیت لکھے
مگر اچانک یہ کیا ہُوا کہ
کسی نے پھُولوں کو رَوند ڈالا
میرے چمن کو جَلا کے ظالم نے
خُون کلیوں کا یُوں بہایا
کہ دَھرتی ماں کا سفید آنچل
لہُو سے رنگیں ہو گیا ہے
جو پھُول ہی نہ رہے تو کیسے
میں اب بہاروں کے گیت لکھوں
چمن میں جب راکھ ہے چمن کی
تو کیسے بُلبُل کے آنسُوؤں کو
میں اپنے زیرِ خیال لاؤں
میں کیسے گاؤں وفا کے نغمے
میں کیسے جشنِ طرب مَناؤں
جو آگ تھی وہ جنُون بن کے

میرے خیالوں پہ چھا گئی ہے
جو خُون تھا وہ سیاہی بن کے
میرے قلم میں سما گیا ہے
میں اپنے آنسُو سنبھال لُوں گا
کہ اب میں اپنے شِکستہ گُلشن کے
ذرّے ذرّے کا ترجماں ہوں
مجُھے قسم ہے شہید پھُولوں کے
ایک اِک' قطرۂ لہو کی
جو اپنے لختِ جگر کو بے جان پا کے روئی
مجُھے قسم ہے اُس ماں کے آنسُوؤں کی
کہ اب میں دھرتی کا سُرخ آنچل
عَلم بناؤں گا لشکروں کا
جو گھر کو میرے جلایا تُم نے
تو اب یہ آتش نہ بجُھنے پائے
کہ سارے قاتل جَلیں گے اِس میں
یزیدؔ، حرملؔ، شمرؔ کے ساتھی

بنامِ دیں خُوں بہانے والے
اور اِن کی ہمّت بڑھانے والے
سبھی میرا یہ اعلان سُن لیں
کہ میں نے آنسُو نہیں بہانے
ہے آنسُوؤں کا حِساب لینا
مُجھے نہ کوئی اَمن سِکھائے
نہ کوئی انجام سے ڈرائے
کہ میں تو اب انتقام لوُں گا
میں اِس لہُو کا خِراج لوُں گا

نِیچ

اَے میرے ہم نَفَس!
ہے دمِ آخریں
شام ڈھلنے کو ہے
دَم نکلنے کو ہے
دل میں ہے اِک چُبھن
رِستی آنکھوں میں ماضی کی ہے داستاں
بیتے لمحے جو صدیوں کی مانند تھے
یاد آتا ہے صحرا کا تنہا سفر

پاؤں چھلنی ہُوئے
ہر قدم حادثہ، جا بہ جا مُعجزے
پیار کی منزلیں، خواہشوں کے ثمر
قصّۂ مُختصر، کٹ گیا ہے سفر
وقتِ آخر ہے، دامن میں کُچھ بھی نہیں
یاد آیا مگر، اَے مِرے ہم نشیں!
میری مُٹھی میں سرسوں کے کُچھ بیج ہیں
حاصِلِ زندگی، موتیوں کی طرح
مُجھ میں ہمّت نہیں، اَے میرے ہم نشیں!
تُو مرا کام کر
میرے خوابوں میں بھگو کر
چند اُمیدوں کے بیج
سوچ کے تپتے صحرا میں چاروں طرف پھینک دے
ہے یہ میرا یقیں، میرا ایمان ہے
آنسوؤں کی نمی اور دُعاؤں کی بارش سے یہ
پھُول بن کر بدل دیں گے صحرا کو گُلزار میں

پا برہنہ ہے وہ
اور راہ میں ہر طرف
خار ہی خار ہیں
کیا کروں ہم نشیں؟
سوچتا ہوں یہی
وقتِ آخر ہے اور
بند مُٹّھی میں ہیں
چند اُمیدوں کے بِیج

اَے میرے ہم نشیں!
ہے بہت لازمی، یہ اِمر اِس لئے
بعد میرے چلی آ رہی ہے
مِری نسلِ نو
جس کے جذبے حَسیں
جس کی ہمّت جواں
علم و دانش میں مجُھ سے بہت ماوراء
جوش ہے، عزم ہے، اِس میں طاقت بھی ہے
زندگی سے بھری اِس کی آنکھوں میں ہیں
خواب تسخیر کے، ہُنر تعمیر کے
الغرض شان سے، آن سے، بان سے
یُوں چلی آ رہی ہے میری نَسلِ نَو
پر مجُھے فکر ہے، اَے میرے ہم نشیں!
بے خبر ہے وہ رَستے کے گرداب سے
میں پریشان ہوں
راستے میں کہیں، کوئی سایہ نہیں